زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

ماہنامہ

# میثاق

خط و کتابت
اور
ترسیل زر کا پتہ
منیجر ماہنامہ "میثاق"
رحمان پورہ۔ اچھرہ
لاہور-۱۲

ہندوستانی خریداروں
کیلئے
ترسیل زر کا پتہ
منیجر ماہنامہ "الفرقان"
کچہری روڈ
لکھنؤ



جلد ۶ | شوال سنہ ۱۳۸۱ھ | شمارہ ۴

## فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تذکرہ و تبصرہ

ہمارے ملک میں جو دستور نافذ کیا گیا ہے وہ جیسا کچھ بھی ہے اس اعتبار سے بہر حال خوش آئند ہے کہ اس نے قوم کے لیے مارشل لا سے نکلنے اور جمہوریت کی طرف بڑھنے کی ایک راہ کھولی۔ یہ راہ اگرچہ بہت کشادہ نہیں ہے ہم ملک کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر غنیمت ہے۔ اگر کام کرنے والوں نے پچھلے تجربات سے فائدہ اٹھایا اور ذمہ داری کے صحیح احساس کے ساتھ کام کیا تو انشاء اللہ یہ دستور ایک معیاری دستور کی تمہید ثابت ہوگا۔

---

اس دستور کی کامیابی اور ناکامی کا بہت کچھ انحصار بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کی فہم و بصیرت اور ان کے سیاسی کردار پر ہے۔ اگرچہ جس وقت ان کا انتخاب ہوا تھا یہ بات عوام کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ بالآخر یہی لوگ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے نمائندوں کا انتخاب بھی کریں گے۔ لیکن صدرِ ریاست نے یہ بارِ امانت انہی پر ڈالنا موزوں خیال فرمایا۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ لوگ اس امانت کے کس حد تک اہل ثابت ہوتے ہیں اور صدرِ ریاست نے جو امیدیں اُن سے باندھی ہیں وہ

کہاں تک پوری ہوتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان لوگوں نے اپنے ووٹوں کی صحیح قدر نہ پہچانی اور اس قسم کے نمائندے آ دبرنہ آ سکے جس قسم کے نمائندے اس دستور کے پیش کردہ نصب العین کے لحاظ سے اس ملک کی اسلامی و سیاسی ترقی کے لیے مطلوب ہیں تو اس سے صرف وہ نظام ہی نہیں متاثر ہوگا جو اس دستور کے تحت اس ملک میں قائم ہونے والا ہے بلکہ اس اعتماد کو بھی بڑا صدمہ پہنچے گا جو صدر ریاست نے بنیادی جمہوریتوں کے نظام پر قولاً و عملاً بار بار ظاہر فرمایا ہے۔ یہ امتحان بنیادی جمہوریتوں کے لیے بڑا ہی سخت ہے۔ خدا کرے وہ اس امتحان میں پوری اُتر سکیں۔

ہم اس پہلو سے بھی اس دستور کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس میں اسلام کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے بلکہ قانون سازی کے معاملہ میں بھی اور تمدنی و تہذیبی دائروں میں بھی اس کے حدود و قیود کو ملحوظ رکھنے کا عہد و اقرار کیا گیا ہے۔ اس باب خاص میں ہمارے نزدیک اصلی اہمیت دستور کے الفاظ کی نہیں بلکہ دستور کو چلانے والوں کے نیت و ارادہ کی ہے۔ اگر ان کے اندر یہ ارادہ موجود ہو کہ وہ پاکستان کو ایک صحیح قسم کی اسلامی ریاست بنائیں تو ان کی رہنمائی کے لیے وہ الفاظ کافی ہیں جو دستور میں رکھے گئے ہیں اور اگر خدانخواستہ یہ ارادہ موجود نہ ہو تو یہ الفاظ تو درکنار واضح سے واضح اور قطعی سے قطعی الفاظ اور فقروں سے بھی اسلام کو کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ ہمیں توقع یہی کرنی چاہیے کہ انشاءاللہ یہ الفاظ بامعنی ثابت ہوں گے اور اس ملک کی ترقی اسلامی خطوط ہی پر ہوگی۔

---

دستور کا یہ پہلو تقاضا کرتا ہے کہ ووٹ دینے والے حضرات ووٹ دیتے وقت امیدواروں کے اسلامی ذہن و کردار پر ضرور نگاہ رکھیں۔ اگر اسلامی ذہن و کردار رکھنے والے لوگ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں نہ پہنچے تو دستور کے وہ الفاظ بالکل بے معنی اور بے اثر ہو کر رہ جائیں گے جو اسلام کے حق میں ہیں۔ لوگوں کو اس حقیقت پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی کہ اسلامی ذہن و کردار صرف دعوے کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی شہادت دعویٰ کرنے والے کی عملی زندگی فراہم کرتی ہے۔ ووٹ مانگنے والوں میں سے تو شاید ہی کوئی شخص ایسا نکلے جو اس بات کا مدعی نہ ہو کہ اس نے ووٹ مانگنے کا یہ دردِ سر صرف اسلام کے لیے اختیار کیا ہے لیکن ووٹ دینے والے اگر چاہیں گے تو اس کی زندگی کے پچھلے اوراق پر ایک نظر ڈال کر بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ مدعی اپنے دعوے میں سچا ہے یا جھوٹا۔

ہم نے اگرچہ اقامتِ دین کے اُس نصب العین کے لیے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے پیشِ نظر رہا ہے انتخابات کی راہ کو کبھی وقعت نہیں دی ہے ۔ اور اب بھی ہم پُورے شرح صدر کے ساتھ اپنی اسی رائے پر قائم ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری یہ رائے بھی ہے کہ اگر ہونے والے انتخابات میں اسلامی ذہن و فکر اور اسلامی کردار رکھنے والے قابل اور ذہین افراد کی ایک معتدبہ تعداد منتخب ہو کر قومی اسمبلی میں نہ پہنچ سکی تو اس سے اسلام کے مقصد کو نقصان پہنچے گا ۔ موزوں نمائندوں کا انتخاب اگرچہ صحیح طریقہ پر سیاسی پارٹیاں ہی کر سکتی تھیں لیکن اس وقت جب کہ وہ موجود نہیں ہیں اس کے سوا چارہ نہیں کہ اسلامی فکر رکھنے والے قابل اور ذی اثر اشخاص خود اپنے مناسب حلقوں سے کھڑے ہوں۔ انشاء اللہ ان کا یہ کام خدمت اسلام میں محسوب ہو گا۔

---

مشاورتی کونسل سے متعلق صدرِ ریاست کی خدمت میں ہماری گذارش یہ ہے کہ وہ اس کے لیے ایسے اشخاص کا انتخاب فرمائیں جو اپنی دینی بصیرت کے لحاظ سے ممتاز بھی ہوں اور جن کے فکر و نظر پر عامۂ مسلمین کو اعتماد بھی ہو۔

ہماری قوم کے نئے اور پرانے دونوں گروہوں میں متوازن ذہن و فکر کے اربابِ بصیرت موجود ہیں۔ اگر ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا تو شاید اس خلیجِ اختلاف کو پاٹا جا سکے جو اسلام سے متعلق ہمارے متجددین اور علماء کے درمیان حائل ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی پہلو سے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کی گئی جو اسلام کو ایک بازیچۂ اطفال بنائے ہوئے ہیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ یہ خلیجِ اختلاف وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے گی اور نہیں معلوم کہ آئندہ یہ کس انجام پر منتہی ہو۔ ہم اس سے پہلے بھی اس اختلاف کی سنگینی پر ان صفحات میں لکھ چکے ہیں اور اب اس موقع پر بھی اس کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہماری یہ معروضات لائقِ اعتنا سمجھی جائیں گی۔

(۲)

ماہ مارچ کا ایک اہم واقعہ فرانس اور الجزائر کے مابین جنگ بندی کا معاہدہ ہونا ہے ۔ اس معاہدہ کی رو سے جنگ ختم ہو گئی ہے۔ جو یکم نومبر ۱۹۵۴ء کو شروع ہوئی تھی اور جس کے نتیجہ میں تقریباً (بقیہ بر صفحہ ۵۴)

## تدبّرِ قرآن

امین احسن اصلاحی

# تفسیر سورۂ بقرہ

## (۲۴)

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ..... قَدِيْرٌ | عفو کے ایک معنی تو دل سے معاف کر دینے کے ہیں اور دوسرے معنی کسی کو نظر انداز کر دینے کے بھی ہیں مثلاً يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۱۵-مائدہ (اور تمھارے لئے بیان کرتا ہے بہت سی وہ چیزیں جو تم کتاب کی چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں کو نظر انداز کرتا ہے) صفح کے معنی چشم پوشی کرنے اور نظر انداز کرنے کے ہیں، کسی حماسی کا شعر ہے ؎

صفحنا عن بنی ذهل		وقلنا القوم اخوان

ہم نے بنی ذحل کی شرارتوں سے چشم پوشی کی اور خیال کیا کہ یہ لوگ اپنے ہی بھائی ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ ابھی کچھ دنوں ان یہودیوں کی شرارتوں کو نظر انداز کرو۔ یہاں تک کہ اللہ ان کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ یہ پوری آیت یہود کے لئے تہدید و وعید ہے اور اس بامرہ کے اجمال کے اندر وہ ساری باتیں چھپی ہوئی ہیں جو بعد میں یہود کے ساتھ جنگ کے حکم، ان کی ہزیمت اور قتل و جلاوطنی اور ادائے جزیہ وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ..... بَصِيْرٌ | یہ مسلمانوں کو معاندین اسلام کی مخالفتوں کا علاج بتایا گیا ہے کہ اگر تم ان فتنوں پر غالب آنا چاہتے ہو تو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اسی سے تمہاری وہ روحانی و اخلاقی تربیت ہوگی جو تمہیں ایک طرف تو مخالفین کی وسوسہ اندازیوں سے بالکل مامون کر دے گی، دوسری طرف تم کو جماعتی حیثیت سے ایک ایسی بنیان مرصوص بنا دے گی کہ کوئی طاقت بھی تمہیں ہلا نہ سکے گی۔ قرآن مجید

ہیں نماز اور زکوٰۃ کو تمام دین کی بنیاد، تمام تربیت و اصلاح کی اساس اور تمام قوت و طاقت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسری ساری چیزوں کو ان کے تابع قرار دیا گیا ہے مکی سورتوں میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ [وسلم] کو دشمنوں کے مقابل میں صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے وہاں نماز کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی بقرہ میں تحویل قبلہ کے حکم کے بموجب مخالفت کا طوفان اٹھا ہے تو فرمایا گیا کہ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۱۵۳۔ بقرہ۔ (اے ایمان والو۔ صبر اور نماز کے ذریعہ سے مدد چاہو بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے) اسی طرح جو لوگ مضبوط تربیت کے بغیر جنگ و جہاد کے لیے جلدی مچاتے تھے ان کو نماز و زکوٰۃ کے ذریعہ سے اپنی تربیت کرنے کی ہدایت کی گئی۔ کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (ابھی اپنے ہاتھ روکو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) سورہ حج میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم دینے کے بعد ہدایت فرمائی کہ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ۔ ۷ (پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔)
یہاں بھی نماز اور زکوٰۃ کا حکم اسی پہلو سے ہے۔ اس پر مزید بحث آگے آئیگی۔

| | |
|---|---|
| وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی، تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ ...... اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ | ھُوْد۔ ھَائِد کی جمع ہے اس کی تحقیق آیت ۶۲ کے تحت گذر چکی ہے۔ |

جس طرح نسخ کا اعتراض مسلمانوں کے دلوں میں شک اور تردد پیدا کرنے کے لیے اٹھایا گیا اسی طرح یہ پروپیگنڈا بھی یہود اور نصاری دونوں کی طرف سے کیا گیا کہ نجات حاصل کرنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو یہ ہے کہ آدمی یہودیت اختیار کرے یا نصرانیت، یہ دونوں خدائی دین ہیں ان کے ہوتے ہوئے کسی نئے دین کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔

یہود اور نصاری یوں تو آپس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، آئے دن ان کے اندر مذہبی اختلاف کی بنا پر خون خچر ہوتا رہتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی مخالفت کے لیے دونوں آپس میں بڑے رواداربن گئے تھے، دونوں نے مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا تھا اور ہم زبان ہو کر یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ جس کو نجات مطلوب ہو وہ یہودی بنے یا نصرانی یہ نیا دین چلا گیا ہے، یہ تو محض ایک فتنہ ہے۔

یہود نے اسلام کی مخالفت میں رواداری کی یہ روش مشرکین تک کے معاملہ میں اختیار کر لی

تھے۔ نصاریٰ تو بہر حال ان کے اپنے ہی بھائی بند تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کی اس حق دشمنی کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ﴿نساء﴾ (کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ ملا، وہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر ہیں)

اس پروپیگنڈے کو اس چیز سے تقویت پہنچی ہوگی کہ اہلِ عرب اہلِ کتاب سے پہلے سے حسنِ ظن رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی تائید میں یہ بھی کہتے رہے ہوں گے کہ یہودیت اور نصرانیت کے آسمانی دین ہونے سے تو قرآن کو بھی انکار نہیں ہے۔ ان وجوہ سے قرآن نے اس کی بھی تفصیل کے ساتھ تردید کی۔ فرمایا کہ "تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ" یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں، یعنی یہ محض ان کی من گھڑت باتیں ہیں جو بغیر کسی سند اور دلیل کے انہوں نے محض اپنے جی سے گھڑ رکھی ہیں، خدا نے یہودیت اور نصرانیت کسی کے حق میں بھی یہ پروانہ جاری نہیں کیا ہے کہ جو یہودی یا نصرانی بن گیا اس کے لیے جنت ہے، اگر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں تو اپنے اس دعوے کی سچائی پر اپنی کتاب سے کوئی دلیل پیش کریں۔ اس طرح کی ان کی بہت سی تمنّائیں اور خواہشیں تھیں جو انہوں نے دین اور عقیدہ بنا کر بلا کسی سند کے اپنے دلوں میں پال رکھی تھیں اس وجہ سے قرآن نے اگرچہ یہاں ذکر ایک ہی کا کیا ہے لیکن جمع کا لفظ استعمال کر کے اشارہ ان سب کی طرف کر دیا ہے۔ ہم اسی سورہ کی آیات (۷۸ - ۸۱) کی تفسیر کرتے ہوئے ان امانی کی تفصیل پیش کر چکے ہیں۔

بَلَىٰ، مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ ..... يَحْزَنُونَ | یعنی نجات یافتہ اور مستحق جنت ہونے کے لیے یہودی یا نصرانی ہونا شرط نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ آدمی ایک تو مسلم بنے دوسرے یہ کہ محسن بنے۔ اسلام کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کے حوالہ کر دے اس کے نبیوں اور رسولوں میں کوئی تفریق کیے بغیر اپنی پوری زندگی کو اس کی شریعت کے تابع کر دے۔ احسان کا مفہوم یہ ہے کہ شریعت کے احکام کی تعمیل پورے خلوص

پوری دیانت اور کامل راستبازی کے ساتھ کرے۔ جو لوگ اس طرح خدا کی بندگی اور اس کی اطاعت کا حق ادا کریں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے، ایسے لوگوں کے نہ کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم۔ یہی تمام انبیاءؑ اور تمام آسمانی صحیفوں کی تعلیم ہے اور عقل اور فطرت کا تقاضا ہے۔

یہ پورا مضمون اسی سورہ کی آیات ۸۰ - ۸۱ میں تفصیل کے ساتھ گذر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس کے مختلف پہلوؤں پر وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ ..... وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ | یعنی اسلام کی مخالفت کے لیے یہود اور نصاریٰ دونوں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے ہیں اور ایک دوسرے کو بڑی فیاضی کے ساتھ نجات یافتہ اور جنتی قرار دے رہے ہیں۔ لیکن اس پلیٹ فارم سے الگ ان کی باہمی تکفیر و تفسیق اور جنگ و جدل کا یہ حال ہے کہ یہود نصاریٰ کی کوئی جڑ بنیاد تسلیم نہیں کرتے اور نصاریٰ یہود کے لیے کوئی بنیاد تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ دونوں ایک ہی کتاب کی پیروی کے مدعی ہیں، تورات دونوں میں مشترک ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آج جو ان کے اندر یہ گٹھ جوڑ ہوگیا ہے یہ نہ تو دین کے تحفظ کے لیے ہے نہ کسی اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی ہے بلکہ محض اسلام دشمنی کا جذبہ ہے جس نے ان کو متحد کر دیا ہے۔

كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ..... فِيهِ يَخْتَلِفُونَ | الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (جو علم نہیں رکھتے) سے مراد مشرکین بنی اسمٰعیل ہیں، اس لیے کہ یہ کتاب و شریعت سے ناآشنا اُمّی تھے۔ ان کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے بھی انہی لوگوں کی سی بات کہی۔ یعنی یہ بھی اپنے سوا سب کو باطل پر سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام کی مخالفت کے لیے آج یہ بھی اس مشترکہ محاذ میں شامل ہیں۔ وہ ایک کتاب کے علم اور عمل کے مدعی ہوتے ہوئے دین کی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور یہ بغیر کسی علم ہی کے پانچوں سواروں میں جا شامل ہوئے ہیں۔ "کَذَٰلِکَ" اور "مِثْلَ قَوْلِهِمْ" کے الفاظ بظاہر دونوں ایک ہی مفہوم کے حامل نظر آتے ہیں لیکن غور کرنے سے دونوں سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک سے محرک اور جذبہ کا اشتراک ظاہر ہوتا ہے، دوسرے سے نتیجہ کا۔ یعنی یہ بھی نیت اور عمل دونوں میں انہی یہود و نصاریٰ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

آخر میں بطور وعید کے فرمایا کہ ان کی اس نزاع کا فیصلہ اب آخرت میں خدا کی عدالت میں ہوگا اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ تم اس نزاع میں صرف تبلیغِ حق کے ذمہ دار ہو۔ اس سے زیادہ تمہارے اُوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰہِ.... عَذَابٌ عَظِیْمٌ یہ اشارہ ہے ان مدعیانِ جنت کے اُن کارناموں کی طرف جو انہوں نے باہمی عناد وعداوت کی بنا پر ایک دوسرے کے معابد کو تباہ و برباد کرنے کے سلسلہ میں انجام دیے۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان بیت المقدس میں بھی ایک دوسرے کو ذکر و عبادت سے روکنے کے لیے نہایت خونریز جنگیں ہو چکی ہیں اور باہر بھی جہاں جہاں اور جب جب ان میں سے کسی کو موقع ملا ہے اس نے مخالف فریق کے عبادت خانے برباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ نصاریٰ نے لوگوں کو حج بیت اللہ سے روکنے کی سعی کی لیکن جب اس کوشش میں ان کو ناکامی ہوئی تو ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کر دی اور خانہ کعبہ کو منہدم کر دینے کا ارادہ کر لیا جس کی پاداش میں اس پر اور اس کی فوجوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔

ان واقعات کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ جو لوگ آج اسلام کی مخالفت میں یوں ہم زبان ہو گئے ہیں ان کے باہمی تعصبات کا کیا حال رہا ہے۔ اور نجات و ہدایت کے ان ٹھیکیداروں کے کارنامے خدا کی مساجد کے معاملہ میں کتنے سیاہ ہیں۔ ساتھ ہی مساجدِ الٰہی کا مرتبہ و مقام واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ دنیا میں سب سے زیادہ ظالم وہ مدعیانِ ہدایت و تقویٰ ہیں جو اللہ کی مسجدوں سے ذکرِ الٰہی کرنے والوں کو روکیں اور ان مساجد کی بربادی کے درپے ہوں۔ جو گھر خدا کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا ہے وہ خدا کا گھر ہے، کسی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ خدا کے گھر میں اس کی تخریب کی جسارت کے ساتھ داخل ہو، اللہ کے گھر میں داخل ہونے کا واحد طریق یہ ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہو ڈرتے ہوئے اور لرزتے ہوئے داخل ہو۔ جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

مساجدِ الٰہی کے احترام کے اسی اصول کے تحت مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ جنگ

کی حالت میں بھی ان کے گرجوں اور معابد کے ہدم یا ان کی توہین کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ مقام ان مسلمانوں کے لیے خاص طور پر قابلِ غور ہے جو محض گروہی تعصبات کے تحت اپنے سے ذرا مختلف مسلک رکھنے والوں کو اپنی مساجد سے روکتے ہیں اور بعض اوقات دوسرے مسلک رکھنے والوں کی مساجد کی بے حرمتی کرنے کی جسارت بھی کر گزرتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ..... اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ | یہ اس وجہ نزاع و اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو یہود و نصاریٰ |

کے درمیان معابد و مساجد کی توہین و تخریب کا سبب ہوئی۔ یہود و نصاریٰ دونوں کا قبلہ بیت المقدس تھا لیکن نصاریٰ نے خاص طور پر اس کی مشرقی سمت کو اپنے قبلہ کے لیے انتخاب کیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ وہ حصہ جس میں حضرت مریم نے اعتکاف فرمایا تھا اسی سمت میں تھا۔ بیت المقدس کے اس عہد کے نقشہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وہ حصہ جو خواتین کی عبادت کے لیے مخصوص تھا، اسی جانب تھا اور قرآن سے بھی کچھ ایسا ہی اشارہ نکلتا ہے۔ سورۂ مریم میں فرمایا ہے۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۶) (اور کتاب میں مریم کی سرگذشت کو یاد کرو، جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر مشرقی جانب میں معتکف ہو بیٹھی) اس ضد میں یہود نے اس کی مغربی سمت کو اختیار کیا ہوگا اور پھر اندرونِ بیت المقدس کی یہ تقسیم اس سے باہر نکل کر مستقلاً مشرق و مغرب کی تقسیم بن گئی ہوگی۔ یعنی نصاریٰ نے سمت مشرق کو اپنا قبلہ بنا لیا اور یہود نے مغرب کو۔ پھر اس مشرق و مغرب کے اختلاف نے دونوں کو خوب خوب لڑایا۔ بیت المقدس کے اندر بھی اور اس سے باہر بھی۔ اور اس کے نتیجہ میں دونوں فریق نے ایک دوسرے کے معابد کی پوری بیدردی کے ساتھ بے حرمتی کی۔

قرآن مجید نے یہاں اس سبب اختلاف و نزاع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی لغویت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ مشرق ہو یا مغرب، دونوں سمتیں اللہ ہی کی ہیں۔ ان میں سے جس سمت بھی انسان رُخ کرے اگر وہ خدا کی طرف متوجہ ہے تو اس کا رُخ خدا ہی کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس چیز کو یہود و نصاریٰ نے سر پھٹول اور ہدم معابد و مساجد کا سبب بنایا تو یہ ان کی جہالت و حماقت ہے۔ سمتوں اور جہتوں میں سے کسی سمت و جہت کو بھی خدا کے ساتھ اختصاص

نہیں ہے۔ وہ بیت المقدس کو قبلہ قرار دے کر جدھر بھی رُخ کرتے، خدا ہی کی طرف رُخ کرتے۔ خدا کی قدرت اور اس کے علم کی وسعت ہر چیز کو محیط ہے۔

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

یہ بحث مزید تفصیل کے ساتھ آگے تحویلِ قبلہ کی آیات کے تحت آ رہی ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا...... كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ | ولد کے معنی اولاد کے ہیں۔ یہ لفظ واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔

اُوپر اسلام کے خلاف محاذ قائم کرنے والوں کے ان کارناموں کا حوالہ دیا تھا جو انھوں نے خدا کی مساجد کی تخریب کے سلسلہ میں انجام دیے ہیں، اب یہ ایک اشارہ ان کے مشرکانہ عقائد کی طرف بھی فرما دیا تاکہ ہدایت اور نجات کی اجارہ داری کے ان مدعیوں کا یہ پہلو بھی سامنے آجائے کہ عقیدہ کے اعتبار سے یہ کس سطح پر ہیں۔ اس سلسلہ میں فرمایا کہ یہ لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ یہود عزیر کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، نصاریٰ مسیح کو اور مشرکینِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ان سب کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ سبحانہٗ، خدا اس طرح کی تمام نسبتوں سے پاک اور ارفع ہے۔ کوئی چیز کسی پہلو سے بھی اس کی ذات یا صفات یا اس کے حقوق میں شریک وسہیم نہیں ہے بلکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں اس کی مخلوق ومملوک ہیں۔ کسی کا یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ اس کی بندگی اور اطاعت کے قلادہ سے آزاد ہو بلکہ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ...... كُنْ فَيَكُوْنُ | ابداع کے معنی کسی شے کو عدم سے وجود میں لانے اور بغیر کسی مادہ و مثال کے ایجاد کرنے کے ہیں۔ اسی سے 'بدعت' کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں، دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کرنا جس کے لیے کوئی مثال، نظیر اور کوئی ماخذ و مصدر نہ ہو۔ بدیع اسی سے فعیل کا وزن ہے اور معنی میں فاعل کے ہے۔

اُوپر والی آیت کے مضمون تنزیہ باری کی یہ مزید وضاحت ہے کہ یہ بیٹے بیٹیاں جو خدا کے لیے فرض کیے گئے ہیں اس واہمہ کی بنیاد پر فرض کیے گئے ہیں کہ جس طرح دوسرے اپنے معاملات کے انتظام و انصرام میں معاونین اور شرکاء کے محتاج ہوتے ہیں اسی طرح خدا بھی شرکاء اور معاونین کا محتاج ہے۔ حالانکہ خدا اس قسم کے شرکاء اور معاونین سے بالکل بے نیاز و مستغنی ہے۔ وہ تنہا

و زمین کو تنہا اپنی قدرت و حکمت سے وجود میں لایا ہے اور جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو بس فرما دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ ایسی بے نیاز و مستغنی اور ایسی بے ہمہ و باہمہ قادرِ مطلق ذات کے ساتھ آل و اولاد کا کیا جوڑ۔

| الذین لایعلمون | وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ... لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ |
|---|---|

سے، جیسا کہ آیت ۱۱۲ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے مشرکین بنی اسمٰعیل مراد ہیں۔ اُوپر اہلِ کتاب کے اعتراضات اور ان کی وسوسہ اندازیوں کا ذکر فرمایا تھا۔ اب اسی متحدہ محاذ مخالفت کے تیسرے رُکن یعنی مشرکین کے بعض مطالبات کا ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے۔

ان کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ خدا ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو خدا نے انہی کو ہمارے اندر سے ہم کلامی کے لیے کیوں منتخب کیا، آخر ہم جو قریش کے سردار اور لیڈر ہیں اور اثر و اقتدار میں محمدؐ سے کہیں اُونچے ہیں، خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا؟ اس مطالبہ کا جواب قرآن نے بعض جگہ دیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے کہ "کسی انسان کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے براہِ راست کلام کرے، وہ صرف وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی آڑ سے بات کرتا ہے"۔ پھر وحی اور رسالت سے متعلق یہ وضاحت فرما دی ہے کہ ہر کس و ناکس اس منصب کا اہل نہیں ہوا کرتا" یہ صرف اللہ تعالےٰ ہی جانتا ہے کہ کون اس منصبِ عظیم کے لیے اہل ہے"۔ لیکن یہاں خاص اس مطالبہ کا جواب نہیں دیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا جواب نہ دینے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مطالبہ اس قدر گستاخانہ اور احمقانہ ہے کہ اس کا جواب نہ دینا ہی اس کا جواب ہے۔ غور کیجیے کہ قرآن کی اس موقع پر اس خاموشی نے سردارانِ قریش کے پندارِ سیادت پر کیسی کاری ضرب لگائی ہوگی۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ نشانی سے ان کی مراد کوئی ایسی نشانی تھی جو ایک محسوس معجزہ کی نوعیت کی ہو جس کو دیکھ کر ہر شخص پکار اُٹھے کہ بے شک اس نشانی کا دکھانے والا خدا کا فرستادہ اور اس کا رسول ہے، مثلاً یہ کہ اس رسول کے ساتھ ساتھ کوئی فرشتہ اس کی رسالت کی منادی کرتا پھرے، یا اس کے حکم سے مُردے جی اُٹھیں، یا اس کے اشارے سے پہاڑ چلنے لگیں یا اس کی خواہش پر صحرا چمن بن جائے یا اور نہیں تو کم از کم اس کے ایماء پر

اس عذاب ہی کا کوئی نمونہ نمودار ہو جائے۔ جس کی یہ ہر روز دھمکی سنا رہے ہیں۔

اس مطالبہ کے جواب میں پہلی بات تو یہ فرمائی کہ جس طرح کی نشانی کے لیے یہ مطالبہ کر رہے ہیں بالکل اسی طرح کی نشانی کے لیے اُن قوموں نے اپنے اپنے رسولوں سے مطالبے کیے جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں۔ انہوں نے بھی حق واضح ہو چکنے کے بعد محض رسول کو زِچ کرنے کے لیے اس طرح کی نشانی کے لیے مطالبے کیے اور یہ بھی حق کو سمجھ چکنے کے باوجود محض زِچ کرنے کی خواہش کے تحت یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اِن کے دل بھی بالکل انہی لوگوں کے دلوں کی مانند ہو گئے ہیں۔ یعنی قساوت، طغیانی اور حق دشمنی کی جو سیاہی ان کے دلوں پر چھا چکی تھی وہی سیاہی ان کے دلوں پر بھی چھا رہی ہے۔ پھر لازماً اس کے نتیجہ میں ان پر بھی خدا کی طرف سے اسی طرح کا کوئی عذاب آئے گا جس طرح کے عذاب ان پر آئے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ جہاں تک تمہاری رسالت اور تمہاری دعوت کے حق ہونے کا تعلق ہے اس کے دلائل آفاق سے، انفس سے، آسمان سے، زمین سے، تاریخ سے، آثار سے، ہر پہلو سے ہم نے کھول کھول کر قرآن میں بیان کر دیے ہیں۔ یہ دلائل اس قدر واضح ہیں کہ ان کے بعد کسی نشانی اور معجزہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن یہ دلائل ان لوگوں کے لیے مفید ہیں جو یقین کرنا چاہیں، جو یقین نہیں کرنا چاہتے ان کو دنیا کی کوئی چیز بھی قائل نہیں کر سکتی، ایسے لوگ تو عذاب دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے، یہاں تک کہ وہ عذاب ان کی کمر توڑ کے رکھ دیتا ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی کہ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ۔ ہم نے تم کو حق دے کر اس لیے بھیجا ہے کہ تم اس کے قبول کرنے والوں کو نجات و فلاح کی خوشخبری سنا دو اور اس کی تکذیب کرنے والوں کو اس تکذیب کے انجام بد سے ڈرا دو۔ اس انذار و تبشیر کا فرض انجام دے چکنے کے بعد تمہاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے مطالبوں کی تعمیل میں ان کی خواہشات کے مطابق نشانیاں اور معجزے دکھانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ تم سے جو کچھ پرسش ہو گی تمہارے فرضِ رسالت کی ادائیگی کے بارے میں ہو گی، اس بارے میں ہرگز نہیں ہو گی کہ یہ جہنم میں جانے والے لوگ جہنم میں کیوں گئے، ایمان کیوں نہیں لائے۔

یہ ساری باتیں جو اوپر عرض کی گئی ہیں مکی سورتوں میں پچھلی قوموں کی سرگزشتوں کے ضمن میں

مختلف اسلوبوں سے بیان ہوں گی اس وجہ سے ہم یہاں ان کی زیادہ تفصیل نہیں کرتے۔

| وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى ...... وَلَا نَصِيْرٍ | مشرکین کے رویہ سے مایوس |

کر دینے کے بعد یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہود اور نصاریٰ کا رویہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ بھی تم سے اس وقت تک راضی ہونے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کی ملت کے پیرو نہ بن جاؤ۔ یعنی یہودیت یا نصرانیت نہ اختیار کر لو۔ اس لیے کہ ان کے سامنے سوال صرف حق کی وضاحت اور دلائل کے ظہور کا نہیں ہے بلکہ اپنے اپنے طریقہ پر جمود کا ہے، وہ حق سے زیادہ اپنی خواہشات کے پرستار ہیں اور تمہارے لیے خدا کی طرف سے العلم یعنی علمِ وحی کے آجانے کے بعد ان کی خواہشات وبدعات کی پیروی کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اس وجہ سے ان کو یہ فیصلہ کن جواب دے دو کہ اصل ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی طرف سے آئے تو اب جب کہ میرے پاس اللہ کی ہدایت آچکی ہے میں اس کو چھوڑ کر کسی اور طریقہ کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں۔ یہاں یہود ونصاریٰ کے اختیار کیے ہوئے طریقوں کو اہواء (خواہشات) کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے ہدایت آجانے کے بعد کسی اور طریقہ پر جمے رہ جانا درحقیقت اپنی خواہشات کی پیروی ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ، میں خطاب اگرچہ بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں جو تنبیہ اور عتاب ہے اس کا رُخ یہود ونصاریٰ کی طرف ہے۔ اس طرزِ خطاب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ملیں گی۔

اس آیت میں ملت کا جو لفظ آیا ہے اس کے اصل معنی طریقہ کے ہیں لیکن اس سے کسی شخص یا گروہ کا وہ طریقۂ زندگی مراد ہوتا ہے جس کی بنیاد مذہب اور روایاتِ مذہب پر ہو۔

| اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ .... هُمُ الْخٰسِرُوْنَ | عام اہلِ کتاب سے |

مایوسی کے اظہار کے بعد اُن اہلِ کتاب کا ذکر فرمایا جو اپنی کتاب پر فی الواقع ایمان رکھتے تھے ان کے متعلق فرمایا کہ یہ لوگ اس ہدایتِ الٰہی پر ایمان لائیں گے جو تم ان کے سامنے پیش کر رہے ہو یہاں صالحین اہلِ کتاب مراد لینے کی ہمارے نزدیک کئی وجہیں ہیں۔

ایک تو یہ ہے کہ ان کے متعلق فرمایا ہے یتلونہ حق تلاوتہ (یہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے) ہمارے نزدیک یہ ضمیر مفعول سے حال پڑا ہوا ہے اور مقصد

اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان کا حال شروع سے یہ رہا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کی سچی قدر کی ہے جو ان کو ملی تھی۔ ان لوگوں کے مانند یہ کبھی نہیں رہے ہیں جن کا حال قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا - چارپائے بر و کتابے چند۔ پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ تو ہے لیکن کچھ خبر نہیں کہ ان کتابوں میں کیا ہے۔ بلکہ یہ فکر و تدبر کے ساتھ برابر اس کی تلاوت کرتے رہے ہیں اور ان کی یہ تلاوت طلبِ ہدایت کے لیے تھی نہ کہ محض اپنی من گھڑت آرزوؤں اور خواہشات کے حق میں دلائل ایجاد کرنے کے لیے۔

دوسری یہ کہ ان کے متعلق خبر دی ہے کہ یہ اس ہدایت پر ایمان لائیں گے جو آخری رسُول کے ذریعہ سے اللہ نے اُن پر اُتاری ہے۔

تیسری یہ کہ یہاں ان اہلِ کتاب کے لیے آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ قرآن کے نظائر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صیغہ اہلِ کتاب کے لیے بالعموم مدح کے موقع میں استعمال ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

| | |
|---|---|
| ۱۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (۱۴۶ - بقرہ) | جن کو ہم نے کتاب بخشی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ |
| ۲۔ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ۔ (۱۱۴ - انعام) | اور جن کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر اُترا ہے۔ |
| ۳۔ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ۔ (۳۶ - رعد) | اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ خوش ہوتے ہیں اس چیز سے جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔ |
| ۴۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ۔ (۵۲ - قصص) | اور جن کو ہم نے کتاب دے رکھی ہے اس کے پہلے سے وہ اس پر ایمان لائیں گے۔ |

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ کے مقابل میں اَلَّذِيْنَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ کے الفاظ کے اندر اہتمام اور عنایت کا جو پہلو نمایاں ہے وہ اِن لوگوں سے مخفی نہیں ہو سکتا جو معروف اور مجہول کے مواقع استعمال اور عربی زبان میں ان دونوں اسلوبوں کی ادبی نزاکتوں سے واقف ہیں۔ مذکورہ اسلوب میں معروف کا صیغہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب حقیقت میں انہی کو دی جنہوں نے اس کی قدر کی، جنہوں نے اس کی قدر نہیں کی اُن کو گویا خدا نے کتاب دی ہی نہیں۔ اسی فرق کے سبب سے اُوْتُوا الْكِتَابَ کا صیغہ مدح کے مواقع میں بہت کم استعمال ہوا ہے۔ اولئك یومنون به، خبر ہے الذین آتیناهم الكتاب یتلونه حق تلاوته کی۔ یعنی جو اہلِ کتاب اپنی کتاب کا حق صحیح طریقہ پر ادا کرتے رہے ہیں وہی اس ہدی اللہ پر ایمان لائیں گے جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رُوحانی نعمتوں میں برکت انہی کو عطا فرماتا ہے جو ان کی قدر کرتے ہیں، جو قدر نہیں کرتے ان کو مزید عطا ہونا تو الگ رہا جو عطا ہوئی ہوتی ہیں وہ بھی ان سے سلب کر لی جاتی ہیں۔ آخری شریعت کے بارے میں یہی وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ اس میں تمہاری ذرّیت کے صرف اچھے ہی لوگ حصّہ پائیں گے، جو برے ہوں گے وہ اس سے محروم رہیں گے۔ پھر یہی بات اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر واضح فرمائی تھی کہ جو تقویٰ پر قائم رہیں گے وہی آخری نبیؐ پر ایمان لائیں گے۔ اسی حقیقت کو مختلف اسلوبوں سے حضرت مسیحؑ نے واضح فرمایا۔ تفصیل ان چیزوں کی اپنے مقام میں آئے گی۔

---

## خریدارانِ رسالہ سے

# التماس

"میثاق" کے خریداروں سے التماس ہے کہ دفترِ رسالہ سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ ورنہ تعمیل میں بڑی زحمت ہوتی ہے۔ اور جواب میں بھی تاخیر ہو جاتی ہے۔

منیجر
ماہنامہ میثاق

## مطالعہ حدیث

مولانا عبد الغفار حسن صاحب

# مشلہ معہ

گزشتہ شمارے میں حدیث اور تثبیت القرآن و مشلہ معہ کی تشریح کرتے ہوئے بتلایا گیا تھا کہ اگر حدیث پرکھنے کے لیے عصری تقاضوں کو معیار قرار دیا جائے تو خود قرآن بھی اپنی جگہ قابلِ عمل نہیں رہتا، کیونکہ اس کی بہت سی تعلیمات کو عصری تقاضوں سے متصادم قرار دے کر ٹالا جا سکتا ہے۔

اس شمارے میں حدیث کے پرکھنے کے دوسرے معیار زیرِ بحث آ گئے ہیں۔

(۷-۶-۶)

---

احادیث کے پرکھنے کے لیے ایک اہم معیار یہ پیش کیا جاتا ہے کہ وہ قرآن سے متصادم نہ ہوں۔ اس معیار پر گفتگو سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے لحاظ سے احادیث کا تجزیہ کر لیا جائے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ قرآنی مطالب کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی کتنی قسمیں ہو سکتی ہیں۔

### مضمون کے لحاظ سے حدیث کے اقسام

پہلی قسم :- ایسی احادیث جو قرآنی آیات سے ملتے جلتے مضامین پر مشتمل ہیں۔ بنیادی عقائد و اخلاق پر مشتمل بہت سی احادیث اسی نوع میں شمار ہوتی ہیں۔ اس قسم کی روایات، قرآن مجید سے صرف الفاظ میں مختلف ہوتی ہیں، معنوی لحاظ سے دونوں میں پوری مطابقت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس طرح کی بے شمار روایات میں سے صرف ایک حدیث بطور مثال پیش کی جاتی ہے۔

عن عبد اللہ بن مسعودؓ قال قال ... ابن مسعودؓ سے روایت ہے انہوں نے

رجل یارسول اللہ ای الذنب اکبر عند اللہ قال ان تدعو للہ ندا وھو خلقک قال ثم ای قال ان تقتل ولدک خشیۃ ان یطعم معک، قال ثم ای قال ان تزنی حلیلۃ جارک، فانزل اللہ تصدیقھا والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا آخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق ولا یزنون

(مشکوٰۃ باب الکبائر۔ بخاری و مسلم)

کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے سوال کیا، اللہ کے ہاں سب سے بڑا گناہ کونسا ہے، آپؐ نے فرمایا "یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کے لیے شریک (ہم پلہ) ٹھہراؤ۔" اُس نے پوچھا "پھر کون ساگناہ؟" آپؐ نے فرمایا "یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس اندیشے سے قتل کرڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھانے میں شریک ہوگی۔" اُس نے سوال کیا "پھر کون ساگناہ؟" آپؐ نے فرمایا "کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرو۔" ان ارشادات کی تصدیق و تائید میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ "(رحمان کے بندے وہ ہیں) جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود نہیں پکارتے، اور نہ اس جان کو قتل کرتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے حرمت والا ٹھہرایا ہے، اِلّا یہ کہ کسی حق کی بناء پر اس کا قتل جائز ہو۔ اور نہ وہ بدکاری کرتے ہیں۔"

سورۂ بنی اسرائیل میں قتل اولاد کے سلسلے میں فرمایا، وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ، یعنی اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ مشکوٰۃ کتاب الایمان اور کتاب النفاق و الکبائر میں اس نوع کی متعدد احادیث ملتی ہیں جو اجمال و تفصیل میں بھی قرآن سے یکساں مطابقت رکھتی ہیں۔

**دُوسری قسم:-** ایسی احادیث جن میں قرآن سے زائد مضمون ملتا ہے، اس کی چند شکلیں ہیں۔

(الف) قرآنی اجمال کی تفصیل وتشریح :- مثلاً قرآن میں ہے -
اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ - نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو -
اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ سے متعلق تفصیلات حدیث سے معلوم ہوتی ہیں -

| | |
|---|---|
| اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ | نماز مومنوں پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا |
| کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا - (النساء - ۱۰۳) | فرض ہے - |

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز متعین اوقات میں ادا کرنی ضروری ہے، لیکن اوقات کی پوری تفصیل اور حدبندی حدیث سے واضح ہوتی ہے -

| | |
|---|---|
| اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْا | چور مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ |
| اَیْدِیَھُمَا - | کاٹ ڈالو - |

اس آیت میں چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم موجود ہے مگر کتنا ہاتھ اور کتنی چوری پر کاٹا جائے گا، یہ سب تفصیلات حدیث میں پائی جاتی ہیں -

| | |
|---|---|
| وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ | نبی ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا |
| عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ - (اعراف - ۱۵۸) | ہے اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے |

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منصب بتلایا گیا ہے کہ آپ طیبات (پاکیزہ چیزوں) کو حلال کرتے اور خبائث (ناپاک اشیاء) کو حرام ٹھہراتے ہیں - اب حدیث نے بتلا دیا کہ خرگوش، فاختہ طیبات میں داخل ہیں اور گدھے، کتے، درندے، پنجے دار پرندے اور اس قسم کے دوسرے حیوانات خبائث میں شامل ہیں -

(ب) معنی مقصود کی تعیین :-

| | |
|---|---|
| فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا تَحِلُّ لَہٗ حَتّٰی تَنْکِحَ | پھر بھی اگر طلاق دے دے تو وہ عورت |
| زَوْجًا غَیْرَہٗ - (بقرہ - ۲۳۱) | اس کے لیے حلال نہیں ہوتی جب تک |
| | ایک اور خاوند سے نکاح نہ کرے - |

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری طلاق کے بعد بیوی، شوہر پر حرام ہو جاتی ہے، اب وہ از سرِ نو نکاح کر کے بھی اسے اپنے گھر میں آباد نہیں کر سکتا، ہاں صرف اس صورت میں جبکہ

کسی دوسرے شخص سے وہ نکاح کر لے اب اگر یہ دوسرا شوہر اس کو طلاق دے دے تو پھر پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔ اس آیت میں نکاح کے معنی صرف ایجاب و قبول کے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد جنسی تعلق بھی ہے، یہ تعیین و وضاحت حدیث سے معلوم ہوتی ہے، اسی قسم کے واقعہ میں آپؐ نے ایک عورت سے فرمایا تھا حتّٰی تذوقی عُسَیلتہ۔ (مشکوٰۃ ج ۲۔ باب۔ المطلقہ۔ ثلاثا، بحوالہ بخاری ومسلم) یعنی محض نکاح (ایجاب و قبول) ہی کافی نہیں ہے بلکہ جنسی تعلق سے بہرہ ور ہونا بھی ضروری ہے۔

| | |
|---|---|
| اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۔ (انعام - ۸۱) | جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا تو انہی لوگوں کے لیے امن ہے اور یہ لوگ راہ یاب ہیں۔ |

حدیث میں ہے کہ اس آیت کو سن کر صحابہ کرام نے کہا، اَیُّنَا لَمْ یَظْلِمْ، ہم میں سے کون ہے جو ظلم سے آلودہ نہ ہوا ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پریشانی کو اس طرح دور فرمایا کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے، (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۲ بحوالہ صحیح بخاری۔ مسند احمد) اس تفسیر کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان - ۱۳) بے شک شرک ایک بڑا ظلم ہے۔

اگر اس پیغمبرانہ تفسیر کو تسلیم نہ کیا جائے تو لازم ہوگا کہ ظلم کی ہر قسم کا ارتکاب ایک مسلمان کو امن ونجات سے کلیۃً محروم کر دے گا، کیونکہ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ میں انداز حصر اسی کا مقتضی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ (التوبہ - ۳۵) | جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی بشارت سنا دیجئے۔ |

کنز کے معنی مال جمع کر لینے کے ہیں خواہ تھوڑا ہو یا بہت۔ عربی لغت کے لحاظ سے اس کا یہی مفہوم ہے لیکن جب حضرت عمرؓ نے اس آیت کے عموم کی بنا پر صحابہ کرام کا اضطراب دیکھتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی وضاحت طلب کی تو آپؐ نے فرمایا۔

| | |
|---|---|
| ان اللہ لم یفرض الزکوٰۃ | اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی ہے |
| الا لیطیب بھا مابقی من اموالکم | کہ اس کے ذریعہ سے مال کا باقی ماندہ |
| وانما فرض المواریث (ذکر کلمۃ) | حصہ حلال و پاکیزہ قرار پا سکے، اور میراث |
| لتکون لمن بعدکم فقال فکبّر | اسی لیے فرض ٹھہرائی ہے تاکہ پیچھے رہ جانے |
| عمرؓ۔ (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ۔ الفصل الثانی | والوں کو حصہ مل سکے۔ |

بحوالہ ابوداؤد)

راوی کا بیان ہے کہ یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ نے (خوشی کے مارے) نعرہ تکبیر بلند کیا۔

(ج) شانِ نزول کی وضاحت :- قرآن مجید میں عہد نبوی کے متعدد واقعات مذکور ہیں۔ لیکن اندازِ بیان اتنا مختصر ہے کہ جب تک حدیث نبوی کے ذریعہ پس منظر سامنے نہ آجائے اصل واقعہ کے خد و خال نمایاں نہیں ہو سکتے۔ مثلاً

| | |
|---|---|
| وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى | (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ تعالیٰ تم |
| الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ | سے وعدہ کر رہا تھا۔ دو جماعتوں میں سے |
| أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ | ایک کے لیے کہ وہ تمہارے ہاتھ آجائے |
| لَكُمْ وَيُرِيدُ اللّٰهُ أَنْ يُحِقَّ | گی اور تم چاہ رہے تھے کہ غیر مسلح جماعت |
| الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ | تمہارے ہاتھ آئے۔ اور اصل یہ کہ اللہ تعالیٰ |
| الْكَافِرِينَ۔ (الانفال۔ ۷) | کو منظور یہ تھا کہ حق کا حق ہونا ثابت کر دے |
| | اپنے احکام سے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے |

اس آیت میں غزوہ بدر کی طرف اشارہ ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دو جماعتوں میں سے ایک "اور غیر مسلح جماعت" سے کون سے گروہ مراد ہیں۔

| | |
|---|---|
| وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ | اللہ تعالیٰ ان تین افراد پر بھی مہربان ہوا |

خُلِّفُوْا ۔ (توبہ ۔ ۱۱۸) مؤخر کیے گئے تھے ۔

یہ تین افراد کون تھے اور کس بنا پر اور کس شکل میں مؤخر رکھے گئے تھے ۔ اس کی وضاحت حدیث سے ملتی ہے ۔

| | |
|---|---|
| عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَاءَهُ | پیشانی پر بل ڈالے اور منہ پھیر لیا ۔ اس |
| الْاَعْمٰی ۔ (عبس ۔ ۱،۲) | بنا پر کہ اس کے پاس نابینا آیا تھا ۔ |

قرآن مجید سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پیشانی پر بل کس نے ڈالے اور یہ آنے والا نابینا شخص کون تھا ۔ اس آیت کا پس منظر حدیث ہی سے معلوم ہوتا ہے ۔

| | |
|---|---|
| وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ | اور وہ چاہتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں |
| يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ | کیے ہیں ان پر بھی ان کی مدح کی جائے ، |
| مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ | ایسے لوگوں کے بارے میں ہرگز یہ خیال نہ کرو |
| اَلِيْمٌ ۔ (آل عمران ۔ ۱۸۸) | کہ وہ عذاب سے محفوظ رہیں گے ، ان کے |
| | لیے دردناک عذاب ہے ۔ |

اگر اس آیت کا شانِ نزول معلوم نہ ہو تو قرآن کا طالب علم خوارج کی طرح اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ جس انسانی کمزوری کا اس آیت میں ذکر ہے اس کی بنا پر کوئی مسلمان بھی خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکتا ۔

اس آیت کی وضاحت کے لیے مروان نے اپنے خادم کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس بھیجا اور اُن سے اِس آیت کا مطلب دریافت کیا ۔ ابنِ عباسؓ نے فرمایا ، اس آیت کا تعلق مسلمانوں سے نہیں ہے یہ آیت اہلِ کتاب کے بارے میں نازل ہوئی تھی ۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تورات کی کوئی بات دریافت کی ۔ انہوں نے ازراہِ شرارت اُسے چھپا لیا ۔ اور دوسری بات بتلا کر آپؐ سے یہ توقع رکھی کہ آپؐ اُن کی تعریف کریں گے ، اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔ اگر اس شانِ نزول کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے تو آیت کے فہم میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر محض اس خصلت پر جو آیت میں مذکور ہے عذاب ہونا لازم ہو تو فطرتاً ہر انسان کے دل میں طبعی طور پر یہ خواہش موجود رہتی ہے کہ جو کام وہ نہیں کرتا ، اس پر بھی لوگ اس کی مدح سرائی کریں اور

ان کاموں کو اس کا کارنامہ قرار دیں۔ اس اعتبار سے تو بہت سے مسلمان خدا کے عذاب سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ج ۱ صـ ۴۳۶ بحوالہ صحیح بخاری کتاب التفسیر)

مذکورہ بالا شواہد و نظائر سُن کر کہا جاتا ہے کہ حدیث کی تاریخی حیثیت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اس لیے روایات میں قرآن کے مجمل واقعات کا جو پس منظر بیان کیا گیا ہے اُسے قبول کیا جائے گا۔

لیکن یہاں یہ سوال اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ حدیث کی تاریخی حیثیت کو تو تسلیم کر لیا جائے لیکن اس کے تشریعی اور قانونی درجے کو قبول نہ کیا جائے حالانکہ دونوں قسم کی احادیث کے راوی ایک ہی طرح کے اوصاف کے حامل ہیں، تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔ آخر اس فرق کی وجہ؟

(د) عمومِ قرآن کی تخصیص :۔ قرآن مجید میں بہت سے احکام عام الفاظ میں دیے گئے ہیں۔ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں الفاظ کا ظاہری عموم مراد نہیں ہے بلکہ بعض ایسی صورتیں، جن پر قرآن کے عام حکم کا اطلاق ہو سکتا ہے، اس سے مخصوص یا مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے۔

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِىٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ۔ (نساء - ۱۱) — اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو وصیت کرتا ہے کہ مرد کے لیے دو عورتوں جیسا حصہ ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اولاد بہرحال اپنے ماں باپ کی وارث ہوگی خواہ ان کا کردار یا عقیدہ کیسا ہی ہو۔ لیکن حدیث بتلاتی ہے کہ کافر بیٹا اور باپ کا قاتل وارث نہیں ہو سکتا۔

مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ۔ (النساء - ۱۱) — اس وصیت کے بعد جو تم کرتے ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔

اس آیت میں وصیت کے جواز کے لیے عام حکم ملتا ہے لیکن حدیث میں ہے کہ ایک تہائی سے زیادہ مال میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اس طرح اصل قریبی وارث رشتہ داروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ حدیث کی یہ تخصیص و تبیین قرآن کے بیان کردہ قانونِ عدل کے عین مطابق ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے،

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ۔ (بنی اسرائیل - ۲۶) — اور قرابت دار کو اس کا حق ادا کر دو۔

وَإِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ۔ — اور جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اپنے چہرے دھولو۔

اس آیت میں وضو کا حکم دیا گیا ہے۔ آیت کے الفاظ عام ہیں، خواہ انسان پہلے سے باوضو ہو یا بے وضو، بظاہر ان دونوں ہی حالتوں میں اس پہ وضو فرض کیا گیا ہے۔ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ باوضو شخص کے لیے تجدیدِ وضو ضروری نہیں ہے، ہاں یہ عمل مزید ثواب کا باعث بن سکتا ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ۔ (المائدہ ۳) — تم پر مردار حرام کر دیا گیا ہے۔

المیتۃ کا لفظ عام ہے ہر نوع کے مردے کو شامل ہے۔ لیکن شریعتِ اسلامیہ مردہ مچھلی اور ٹڈی کو حلال ٹھہراتی ہے۔ یہ تخصیص واستثناء حدیث ہی کی بنا پر عمل میں آیا ہے۔

**تیسری قسم:**۔ سرمایۂ سنت کی تیسری قسم وہ ہے جو قرآن سے زائد ہے اور قرآن اس بارے میں بظاہر خاموش ہے۔ سنت سے ثابت شدہ اس طرح کے احکام کے بارے میں یہ کہنا اپنی جگہ درست ہوگا کہ ان کی کوئی نہ کوئی اصل قرآن میں ضرور پائی جاتی ہے، یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس کا علم نہ ہو سکے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اعلام الموقعین ابن قیمؒ ج ۱ - ص۲۱) بلکہ سنت سے ثابت بعض احکام ایسے بھی ملتے ہیں جو قرآن کے ظاہری الفاظ کے مخالف ہوتے ہیں لیکن تعامل امت بتلاتا ہے کہ کسی قابلِ ذکر گروہ یا فرقے نے ان سے اختلاف نہیں کیا ہے مثلاً

قرآن مجید نے سکھائے ہوئے، سدھائے ہوئے شکاری کتے کا شکار حلال ٹھہرایا ہے (مائدہ - ۵) اس سے معلوم ہوا کہ اگر کتا باقاعدہ شکار کے لیے تربیت یافتہ نہ ہو تو اس کا شکار حلال نہیں ہے۔ اب ایک صورت یہ باقی رہ جاتی ہے کہ اگر تربیت یافتہ کتا شکار میں سے کچھ کھالے تو یہ شکار حلال ہوگا یا نہیں؟ اس بارے میں کوئی واضح ضابطہ قرآن میں نہیں ملتا لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شکار بھی حرام ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح - بحوالہ ابوداؤد)

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ محرم کے لیے مطلقاً شکار ممنوع ہے، اور جو عمداً شکار کرے اس پر جزاء واجب کی ہے، (المائدہ - ۹۶) لیکن جو احرام میں غلطی سے شکار کر ڈالے اس کی جزاء کی نوعیت کیا ہوگی؟ اس سے قرآن خاموش ہے لیکن حدیث نے اس کو واضح کیا ہے کہ عمداً اور خطاً دونوں صورتیں جزاء کے لحاظ سے یکساں ہیں۔

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ۔ (النساء - ۲۳)
دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا تمہارے اوپر حرام کر دیا گیا ہے۔

لیکن حدیث اسی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی کو بھی بیک وقت نکاح میں رکھنے سے روکتی ہے ۔ بظاہر اس اضافے کی کوئی بنیاد قرآن میں نہیں ملتی، لیکن اگر وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ کی علت پر غور کیا جائے تو قرآن ہی سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی اصل بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ یعنی دو بہنوں کو سوکنوں کی شکل میں رکھنا ان کے رشتۂ اخوت کو قطع کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔ یہی علت خالہ، بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو ایک ساتھ نکاح میں رکھنے کی ممانعت میں بھی پائی جاتی ہے اس کی وضاحت خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے موقع پر فرما دی ہے۔ واذا فعلتم ذالک قطعتم ارحامکم۔ اور جب تم یہ کام کرو گے تو اپنی قرابتیں کاٹ ڈالو گے۔ (نیل الاوطار کتاب النکاح بحوالہ ابن حبان۔ الموافقات شاطبی ج ۳ ص ۱۹۲)

قرآن میں رضاعی رشتے صرف دو حرام قرار دیے گئے ہیں۔ ماں اور بہن۔ (النساء - ۱۵۲) لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ بھی متعدد رشتے رضاعت کی بنا پر حرام ہیں۔ (مشکوٰۃ ج ۲ باب المحرمات بحوالہ صحیح بخاری)

قرآن مجید میں ایک واضح اصول کے ماتحت نواقضِ وضو کا ذکر کیا گیا ہے، سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ نیند اور دُبر سے خارج شدہ ریح بھی نواقضِ وضو میں شامل ہے۔

قرآن نے خمر کو حرام ٹھہرایا ہے۔ لفظ خمر سے بظاہر شراب کی اتنی ہی مقدار کی حرمت ثابت ہوتی ہے جو نشہ آور ہو لیکن حدیث نے مزید بتلایا۔ ما اسکر کثیرہٗ فقلیلہا حرام۔ (مشکوٰۃ باب بیان الخمر بحوالہ ترمذی و ابو داؤد) جس مشروب کی زیادہ مقدار نشہ آور ہو اس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ یہ ممانعت، اصولِ سدِّ ذریعہ کی بنیاد پر ہے۔

اب چند مثالیں ایسی بیان کی جاتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ حدیث یا اجماع امت کی بنا پر قرآن کا ظاہر مفہوم ترک کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً وَرَبَائِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِ

کُمْ ۔ (نساء۔ ۲۳) تم پر وہ ربائب[1] لڑکیاں حرام ہیں جو تمہاری نگرانی میں پرورش پا رہی ہوں۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ربائب بہرصورت حرام ہیں خواہ وہ زیرِ پرورش ہوں یا نہ ہوں۔ اس آیت میں "فی حجورکم" کی قید محض اظہارِ واقعہ کے لیے ہے۔ کسی قانونی پابندی کے اضافہ کے لیے نہیں ہے۔ (ابن کثیرؒ ج۱ ص۴۷۲ بحوالہ بخاری، مسلم۔)

| | |
|---|---|
| لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا | اگر تمہیں خوف ہو کہ کافر تمہیں ستائیں |
| مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ | گے تو تم پر کوئی گناہ نہیں اگر |
| یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۔ | نماز میں اختصار کرو۔ |

(نساء۔ ۱۰۱)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن سے خوف کی حالت ہی میں نماز قصر کی جا سکتی ہے۔ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف کی حالت ہو یا امن کی، دونوں صورتوں میں بحالتِ سفر قصر کی جا سکتی ہے۔ بلکہ بعض ائمہ کرام کے نزدیک قصر واجب ہے۔

| | |
|---|---|
| یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ | اے ایمان والو! تم پر قصاص لازم |
| عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی | کیا گیا ہے۔ آزاد، آزاد کے بدلے |
| اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ | غلام، غلام کے بدلے ۔ عورت، |
| وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ۔ (بقرہ۔ ۱۷۹) | عورت کے بدلے۔ |

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو قتل کر ڈالے تو وہ مرد قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں تمام مسلمان یکساں ہیں۔ تتکافأ دماؤھم۔ اس لیے عورت کے بدلے مرد قتل کیا جائے گا۔ (ابن کثیرؒ ج۱ ص۲۱۰)

| | |
|---|---|
| اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ | بیشک صفا، مروہ پہاڑیاں |

---

[1] وہ لڑکیاں جو عورت کے پہلے خاوند سے ہوں، دوسرے خاوند کے لیے وہ ربائب کہلائیں گی۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ (بقرہ - ۱۵۹)

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جس نے حج یا عمرہ کیا تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے۔

اس آیت سے بظاہر صفا اور مروہ کے طواف (سعی) کا جواز معلوم ہوتا ہے، یعنی اگر کوئی ایسا کرلے تو کسی قسم کا گناہ لازم نہ آئے گا، لیکن حدیث میں اس آیت کا جو پس منظر بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفا و مروہ کا طواف واجب ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۹۹ بحوالہ بخاری، مسلم)

لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (نور - ۳۳)

اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔ اگر وہ عفت و پاکبازی کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔

اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر وہ لونڈیاں عصمت و پاک دامنی کے بجائے کسی اور وجہ سے بدکاری پر آمادہ نہ ہوں تو ان کو اس پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ حدیث میں اس آیت کا جو شانِ نزول بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کی قید اتفاقی یعنی اظہارِ واقعہ کے لیے ہے، احترازی نہیں ہے۔ (ابن کثیر ج ۳ ص ۲۸۹)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ احادیث اپنے مطالب و مضامین کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں (۱) قرآن کے مترادف (ہم معنی)۔ (۲) قرآن سے زائد یعنی اس کے اجمال کی تفصیل یا عموم کی تخصیص وغیرہ۔ (۳) ایک الگ حکم کا اثبات جس سے بظاہر قرآن ساکت ہے، بلکہ بعض مواقع پر قرآن کا ظاہری مفہوم حدیث سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ اب اگر قرآن سے عدم تصادم اور عدمِ مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ صرف پہلی قسم کی احادیث کو قبول کیا جائے باقی دونوں قسموں کو رد کر دیا جائے تو اس طرح کا خیال امت کے متفقہ تعامل کے یکسر خلاف ہے۔ اس متفقہ تعامل کو قرآن نے سبیل المؤمنین قرار دیا ہے اور اس سے انحراف پر

عذاب جہنم کی شدید وعید سنائی ہے۔

اگر پہلی قسم کی احادیث ہی کو قبول کیا جائے تو یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں ایک یہ کہ پہلی قسم کی احادیث تو قرآن کے ہم معنیٰ ہیں۔ ان کے قبول یا عدم قبول سے دینی معاملات میں کوئی فرق نہیں پڑتا، بہرحال اس تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ دوسری اور تیسری قسم کی روایات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو قرآن کا صحیح مفہوم ہی مختل اور پراگندہ ہو کر رہ جائے گا اور نئے نئے مفسرین جب سنت سے بے نیاز ہو کر قرآن کی تفسیر کریں گے تو امت کی وحدت پارہ پارہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ مذکورہ بالا شواہد و نظائر سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ (باقی)

---

## افاداتِ فراہیؒ

از جناب خالد مسعود صاحب

# اصُولِ تفسیر

(۱)

رضائے الٰہی کا حصول، عہدِ فطرت کا ایفاء، خدا کی غلامی اور اس پر دلی خوشی اور اطمینان کی کیفیت انتہائے سعادت ہے۔ اس انتہائے سعادت تک پہنچنے کا وسیلہ قرآن مجید سے فائدہ اٹھانا، اسے سیکھنا اور سکھانا، اس پر عمل کرنا اور لوگوں کو اس کی ترغیب دینا ہے۔ قرآن کریم سے تعلق ایمان و اسلام کی تصدیق اور مسجودِ ملائکہ فطرتِ انسانی کی تکمیل ہے۔ یہی انتہائے سعادت کی طرف بلند ترین زینہ ہے، جبکہ نچلا زینہ انسان کی صفت نطق و گویائی ہے۔ چنانچہ انسان کی قلبی و ذہنی صفات کی تکمیل اس کی صفتِ گویائی ہی کی مرہونِ منت ہے۔ انسان کی یہ صفت اگر صحیح خطوط پر ارتقا کرے تو اس کی منزل قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بولنے اور پڑھنے والا اسی لئے بنایا ہے کہ وہ اس ہدایت کو حاصل کر سکے جس کا وعدہ اس کے ربّ نے اس کے ساتھ کر رکھا ہے اور کلامِ الٰہی پڑھنے کے قابل ہو سکے تاکہ خدا کے اتارے ہوئے نور سے روشنی پائے اور خدا کی نعمت اور رحمت کی اس پر تکمیل ہو۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ (الرحمٰن ۱-۴) خدائے رحمان نے قرآن کی تعلیم دی، اسی نے انسان کو پیدا کیا، اسی نے اس کو بولنا سکھایا۔

دیکھو، ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے، اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں کتنے اختصار کے ساتھ اشارہ فرمایا ہے۔ ابتدا اپنی ذات کے ذکر سے کی کیونکہ وہی رحمت اور تعلیم کی ابتدا کرنے والا ہے۔ پھر یہ بیان کیا کہ خدا کی رحمت کی تکمیل یہ ہے کہ اس نے قرآن مجید کی تعلیم دی۔ اور اس نے تمہیں اس لئے زندگی بخشی اور بولنا سکھایا کہ تم یہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہیں سے ابن ماجہؒ کی اس روایت کی حکمت

ی واضح ہوتی ہے کہ خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ (تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو چونکہ خود خدا سے سیکھا اور امت کو اس کی تعلیم دی اس لیے حضورؐ بلاشک و شبہ سب سے بہتر انسان تھے حضورؐ کے بعد لوگوں میں سب سے اچھے وہ ہیں جنہیں حضورؐ نے تعلیم دی اور انہوں نے آگے یہ علم پھیلایا علیٰ ہٰذا القیاس فرق مراتب، اسباب و وسائل کی کثرت و قلت اور خلوص نیت اور استقلال کی کمی بیشی کے مطابق دوسرے لوگوں کا درجہ ہے۔ پروردگار کی تعلیم قبول کرنے اور اس کے بندوں تک اس کو پہنچانے سے بڑی بھلائی کیا ہوسکتی ہے؟ انسان کے لیے اس سے بڑھ کر خیر و برکت کی چیز بھلا کیا ہوگی کہ وہ اس مقصود کو پالے جس کے لئے خدا نے اسے پیدا کیا؟ اگر تم یہ کہو کہ خدا نے تو انسان کو عبادت کے لئے پیدا کیا تھا پھر وہ قرآن کے سیکھنے سکھانے کی ترغیب کیوں دیتا ہے تو ہمارا جواب یہ ہے کہ ہر قوم خدا ہی کی عبادت کی دعویدار ہے مگر اس کی عبادت باطل اور ضائع ہوتی ہے جب تک رب کی تعلیم اور ہدایت کے مطابق نہ ہو۔ قرآن تو ہے ہی رب کی تعلیم اور ہدایت۔ اس اعتبار سے یہ عبادت کی بنیاد، اس کا محور اور عبودیت کا مغز اور جوہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی تلاوت عبادت قرار پائی ہے۔

**فریضۂ تدبر قرآن** قرآن مجید سے استفادہ کا دارومدار اس کے سمجھنے پر ہے۔ کوئی بھی کلام اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتا جب تک کہ اس کے اجزاء اور ان کی ترکیب کو نہ سمجھا جائے، یہ کام بڑا غور و فکر چاہتا ہے۔ ہمارے یہاں لوگوں نے جب آیاتِ اللہ میں غور و فکر ترک کر دیا تو سنت کو بدعت اور بدعت کو سنت قرار دینے لگ گئے۔ حقیقت کتنی تکلیف دہ ہے کہ اہلِ حق کے ہاں حق و باطل مشتبہ ہو جائیں اور ان کے اندر حق کی بجائے باطل کی عصبیت پیدا ہو جائے۔ قرآن مجید میں تدبر و تفکر کے فریضہ کا کئی آیات میں احساس دلایا گیا ہے بعض آیات میں تدبر و فکر کے مواقع تو بتلائے گئے ہیں مگر تدبر کے بعد ان سے جو حقیقت نکلتی ہے وہ بیان نہیں کی گئی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم شریعت کے ساتھ ساتھ حکمت کی تعلیم دینے پر بھی مامور تھے چنانچہ حضورؐ نے اس کی تعلیم بھی دی اس کا شوق بھی دلایا اور اس کے طریقوں کی طرف رہنمائی بھی فرمائی۔ حضورؐ کا دستور یہ تھا کہ کبھی کبھی صحابہؓ کرام کے سامنے کوئی مسئلہ پیش فرما دیتے تاکہ اس سے وہ خود استفادہ کریں۔ مثلاً ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا کہ درختوں میں وہ کونسا درخت ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے ا

وہ مسلمان سے مشابہت رکھتا ہے۔ لوگ صحرا کے درختوں پر سوچنے لگے۔ عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ میرے دل میں کھجور کے درخت کا خیال گزرا۔ پھر لوگوں نے عرض کی "یا رسول اللہ آپ ہی ارشاد فرمائیں" حضورؐ نے فرمایا "یہ کھجور کا درخت ہے۔"

حضورؐ نے سوال کرنے سے بھی منع فرمایا تھا۔ منع سوال کا مقصد دوسرے مصالح کے علاوہ یہ تھا کہ لوگ خود بھی عقل اور سمجھ کو استعمال کریں صحیح بخاری باب العلم میں حضرت ثابت بن انسؓ سے روایت ہے کہ

"ہمیں قرآن کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے سے روکا گیا تھا۔ ہمیں اس بات سے خوشی ہوتی کہ اہل بادیہ میں سے کوئی عقل مند آدمی آکر حضورؐ سے سوال کرے۔ ہم ایسے شخص کی بات آخر تک سنتے تھے۔"

یہاں حضرت ثابتؓ کا منع سوال سے اشارہ آیت یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَاءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ (اے ایمان والو ان چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو جو اگر تمہارے لئے ظاہر کردی جائیں تو تمہیں بری لگیں) کی طرف ہے اور عقل مند آدمی کہنے سے ان کی مراد شاید یہ ہے کہ وہ کسی اہم اور مفید معاملہ میں سوال کرتا۔

صحابہ کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی مجلسوں میں قرآن مجید کے معانی کے بارے میں سوال کرتے اور ان پر سوچا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے پوچھا کہ سورہ نصر میں کس بات کا اشارہ ہے۔ مجلس میں جتنے بڑے لوگ تھے ان میں سے کوئی اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ البتہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے اپنی رائے ظاہر کی جس کی حضرت عمرؓ نے تصدیق کی۔ ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے عبد اللہ بن عباسؓ کے اندر فہم قرآن اور تفقہ فی الدین کا شوق دیکھا تو ان پر زیادہ عنایت کرنے لگے۔

## علم اصول تاویل کی تدوین کی ضرورت

جہاں تک تاویل قرآن کو ایک الگ علم قرار دینے کا تعلق ہے، ہمارے علماء نے اصول فقہ تک محدود رکھا اس سے دین سیکھنے کے مقصد کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ اس علم پر اس طرح کا کام نہ ہو سکا جو ایک مستقل فن کے لئے ہونا چاہیئے تھا چونکہ اس کا استعمال ایک محدود دائرہ میں ہوتا رہا اس لئے اس میں وہ اعتبار بھی نہ ہو سکی جو اصول دین کے لئے کی جاتی ہے یہ بات مخفی نہیں کہ دین کے اہم مقاصد تفسیر

سربلندی، عقلوں کی تربیت اور ظاہری اعمال یعنی اخلاق، عقاید اور شرائع کی اصلاح ہیں۔ قرآن مجید نے
ان سب کی طرف نہایت احسن طریقہ سے رہنمائی فرمائی ہے۔ یہ سب اجزاء باہم گرے ہوئے ہیں اور ان
کے جمع ہونے پر ان کی غایت اور مطلوب تزکیہ، حاصل ہوتا ہے۔ انہی تینوں کی بنا پر تین علوم پیدا ہوئے
علم اخلاق و مواعظ، علم کلام اور علم فقہ۔ علم تاویل کو اگر فقہ تک ہی محدود رکھا جائے تو علم اخلاق اور علم
کلام اس کے دائرے سے نکل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے اخلاق و عقائد وغیرہ کی بحثوں میں اپنی رکیک
تاویلات تک کے لئے بھی قرآن کو استعمال کیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کو نہ صرف فقہ بلکہ پورے
علم دین کی اصل قرار دیا جائے اور فن تاویل کو اس طرح مدون کیا جائے کہ اسے ہر وہ شخص استعمال کر سکے
جو قرآن میں سے کوئی سا علم بھی حاصل کرنا چاہتا ہو۔

## علمِ نظام

اوپر کی بحث سے دین کے نظام میں اور انسان کی اصلاح میں قرآن کی تعلیم و تعلم کا جو مقام ہے
بخوبی معلوم ہو چکا ہے اب اس بات پر غور کرو کہ سمجھے بغیر قرآن کا سیکھنا کیا ممکن ہے؟ کیا تم
یہ تصور کر سکتے ہو کہ متکلم نے جس مقصد کے لئے اپنے کلام اور اسلوب بیان کو ذریعہ بنایا ہے، تم اس مقصد سے
واقف ہو سکو گے جب تک تمہیں کلام کے مختلف حصوں کا اجمالی طور پر تعلق معلوم نہ ہو، اس کی مشکلات کا اندازہ
تمہیں نہ ہو اور ربط کلام کے صحیح پہلوؤں کو تم الگ الگ نہ کر لو؟ ایک جملہ دوسرے جملے سے کئی اعتبار
مربوط سمجھا جا سکتا ہے۔ ایسے موقعوں پر جو شخص جملوں کے ربط کا صحیح پہلو نہیں سمجھ سکتا یا اس کی تعیین میں غلطی
کر دیتا ہے۔ تو وہ اصل مفہوم کو کھو بیٹھتا ہے! اور کلام میں جو علم و حکمت پائی جاتی ہے، اس سے وہ مطلع
نہیں ہو سکتا۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ تم کلام کے مختلف حصوں کا تعلق جانے بغیر کلام کو سمجھ لوگے کیونکہ جب تم ا
کے ایک طویل حصہ پر غور کرو گے تو اس کا کچھ مفہوم ذہن سے اتر جائے گا۔ پھر جب ایک حصے کے اجزا
کا تعلق سمجھنا چاہو گے تو دوسری طرف کے بعض پہلو نظر انداز ہو جائیں گے۔ اس طرح اجزائے کلام کی حقیقی
نسبتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی، اس کے بقدر تم کلام کو نہیں سمجھ سکتے لیکن اگر یہ نسبتیں تم سمجھ جاؤ
دیکھ لو کہ وہ عبارت بالکل مربوط کلام ہے جو ایک ہی عمود رکھتی ہے، تو اس کا حسن بیان تم پر ظاہر ہوگا۔ ا
معلوم ہوا کہ معرفت نظام ہی تدبر قرآن کی کنجی ہے۔

## دین میں علمِ نظام کی اہمیت

جو لوگ علم نظام کی ضرورت کے قائل نہیں ان کا ایک خطرناک گم
یہ ہے کہ علم نظام اپنی مشکلات، دشواریوں اور غلطی کے امکانات

وجہ سے مہاتِ دینیہ میں سے نہیں، اس لئے ہمیں زیادہ اہم اور زیادہ نافع چیزوں ہی کی طرف توجہ کرنی چاہیئے کیونکہ حدیث میں بھی آتا ہے کہ من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ (آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کو چھوڑ دے جو اس کے لئے مفید نہیں) ان لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ نظم کلام کے لطیف نکات تلاش کرنا اور بلاغت کے پہلوؤں کا استنباط کرنا فرصت کا کام ہے۔ جو شخص اس علم کو مہماتِ علوم میں شمار کرے اور طلبہ کو اس پر آمادہ کرے، وہ انہیں ایک واجب سے ہٹا کر دوسری طرف لگاتا ہے اور اس طرح نظامِ تعلیم میں دخل اندازی کرتا ہے۔ یہ شبہ ہم نے بعض ایسے لوگوں سے بھی سنا ہے جو نظم قرآن کے وجود کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن اس لئے نازل ہوا کہ ہم اس پر عمل کریں اور اس کے نور سے ہدایت حاصل کریں۔ یہ اس لئے نہیں آیا کہ ہم اس کے لطائف اور اس کی بلاغت کے نکات تلاش کرنے کے درپے ہوں۔ تم نے دیکھا کہ باطل اپنا کام کرنے سے غافل نہیں ہوتا اور لوگوں تک پہنچنے کا راستہ تلاش کرنا اس کے لئے کچھ دشوار نہیں۔ اس کا اگر ایک راستہ بند کرو گے تو دوسری جانب سے آدھمکے گا۔ اللہ کی توفیق سے میں اس شبہ کا جواب دیتا ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراض کرنیوالے ہماری بات نہیں سمجھے۔ بلاغت کے نکات اور اعجاز کے پہلو تلاش کرنا ہمارے نزدیک نہ مقصود بالذات ہے اور نہ ہی اصل غایت ہے۔ بلکہ نظامِ کلام کا جاننا اور آیات کے مفہوم کے ربط کا تلاش کرنا بھی ہمارا مطلوب نہیں۔ یہ تمام چیزیں اسباب ہیں۔ مقصود قرآن کے بیان کا مفہوم سمجھنا ہے۔ علم نظم اسی تدبر کا ایک وسیلہ ہے کیا اب بھی تم یہی گمان رکھو گے کہ تم اس سے مستغنی ہو اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکمت، نور اور شفا کے سرچشموں کے جاننے کی کوئی ضرورت نہیں؟ کیا تم یہ پسند کرو گے کہ اپنے آپ کو ان لوگوں میں شمار کرو، جن کا قول یہ ہے کہ خدا کے اوامر و نواہی جاننے کیلئے ہمارے لئے فقہ کی کتابیں کافی ہیں اور قرآن کی کوئی حاجت باقی نہیں رہی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ظاہری احکام عقائد اور نیتوں سے وابستہ ہوتے ہیں اور عقائد اور نیتیں باطن اخلاق سے وابستہ ہیں۔ اسی طرح افراد کی درستی کا دارومدار جماعت کی درستی پر ہے اور جماعت کی درستی کے لئے حکمت و تدبیر کے بعض اصول درکار ہوتے ہیں۔ جب تک تمام کام ٹھیک ہوتے رہیں جیسے صحت کی حالت میں طبیعت رواں ہوتی ہے، اس وقت تک اخلاق و نیات کی درستی اور اصلاح کے اصولوں کی حاجت ہمیں کم ہوتی ہے لیکن جب فساد غالب آجائے، عقائد خراب ہو جائیں، دل بگڑ جائیں، [illegible]ت کا نظام منتشر ہو جائے، شریعت کا نظم پارہ پارہ ہو جائے اور بدعت و ہوائے نفس کی حجت غالب آنے

لئے، اس وقت ہمیں اس بات کی شدید حاجت ہوتی ہے کہ خدائی حکمت معلوم کریں، شفا کا راستہ جانیں اور دینی اختلافات کے فتنوں سے بچنے کی راہ تلاش کریں۔ یہ حکمت اور ہدایت قرآن حکیم سے حاصل ہو سکتی ہے، جسے خود خدا نے نور اور شفا کا نام دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کی حکمت سے کیا ایک ایسا آدمی واقف ہو سکتا ہے جو ہوا کے ایک جھونکے یا ایک سوار کی سرعت کے ساتھ قرآن کے پاس سے نکل جائے؟ اگر ایسا ممکن ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں آیات میں تفکر و تدبر کا حکم کیوں دیا تھا؟ اگر آیات میں معارف کے خزائن پوشیدہ نہ تھے تو تفکر و تدبر کا فائدہ کیا تھا؟ اگر تمہارا گمان یہ ہو کہ قرآن مجید کے معارف مکمل طور پر اس کی آیات میں بیان ہو گئے ہیں، چاہے کوئی نظم کو سمجھے یا نہ سمجھے جملوں کے تضمنات سے واقف ہو سکتا ہے۔ جس طرح اصل قیمت جواہر کی ہوتی ہے، انہیں ایک لڑی میں پرونا ضروری نہیں تو ہمارا جواب یہ ہے کہ یہ گمان اس لئے پیدا ہوا کہ تم یہ سمجھتے نہیں کہ ہر مرکب میں ترکیب اور نظم کی اہمیت ہوتی کیا ہے۔ اور قرآن میں یہ چیز کتنی ضروری ہے۔ اب ہم خدا کی توفیق سے اس پر گفتگو کرتے ہیں۔

## معرفت نظام کی ضرورت

ا۔ اپنے ارد گرد اور اوپر نیچے کی موجودات پر نگاہ دوڑاؤ۔ تم دیکھو گے کہ یہ نفع بخشی اور تمتع کے لئے ترکیب دی گئی ہیں۔ ان کے منافع و محاسن کا بڑا حصہ ترکیب ہی میں پوشیدہ ہے۔ اگر چاہو تو یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ ہر شے کی اصل ماہیت اور اس کے وجود کی حقیقت ترکیب ہی ہے۔ اس کی ترکیب ختم کر دو تو کچھ باقی نہ رہے۔ اسی لئے صنعت و کمال کا راز بھی درست ترکیب ہی میں پنہاں ہے اور ترکیب کی مضبوطی یا کمزوری ہی کی بنا پر بنانے والے کی مدح و ذم کی جاتی ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس کی ترکیب پر ہوتا ہے۔ گویا ترکیب ہی ہر چیز کی بنیاد ہے اور یہ حقیقت اہلِ عقل سے پوشیدہ نہیں۔

اب کلام میں ترکیب کی اہمیت پر غور کرو۔ کلام کے تمام حصے آپس میں متعلق ہوتے ہیں اور ترکیب کے بعد ذو معنی بنتے ہیں۔ ان کی صورت ترکیبی ہی کلام کے معنی متعین کرتی ہے کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک خاص لفظ میں جب حروف ایک خاص ترتیب سے آتے ہیں تو اس میں معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک جملہ میں کلمات کی ترتیب کا بھی یہی حال ہے۔ وہاں بھی جملہ کے معانی کلمات کی ترتیب سے متعین ہوتے ہیں۔ پھر مختلف جملوں کی ترکیب ہی کے نتیجہ میں ایک عمدہ کلام، ایک پسندیدہ گفتگو اور ایک حکیمانہ بحث پیدا ہوتی ہے، جو علم و فضل اور فصاحت و بلاغت پر مشتمل ہوتی ہے۔ پس اس میں کوئی شک نہیں کہ کلام میں خوبی اس کے نظام ہی سے پیدا

ہوتی ہے اور بلاغت کے لحاظ سے وہ اگر اونچا ہوتا ہے تو اپنے اجزاء کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے نظم و ترتیب کی بنا پر اونچا ہوتا ہے، لہٰذا کوئی شخص اگر کلام کے حسن بیان، قوت استدلال، اس کی تاثیر اور اس کی پوشیدہ حکمت سے واقف ہونا چاہیئے تو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اس کے جملوں کی ترکیب کو سمجھے۔

اگر تمہیں ہمارے اس بیان پر ابھی شک ہو یا تم مزید اطمینان یا وضاحت چاہو تو ایک فصیح و بلیغ خطبہ لو جس میں ترغیب و ترہیب ہو، حکمت ہو، امثال ہوں، حجت و استدلال ہو۔ اب اس خطبہ کا نظام درہم برہم کر دو اور جملوں کو مطالب کی رعایت کئے بغیر آگے پیچھے کر دو۔ اب دیکھو گے تو معلوم ہو گا کہ اس کے دعویٰ و دلیل کا تعلق، اس کی مقدمات سے مقاصد تک تدریج، ضروری مقامات پر وضاحت، اس کا حسن بیان، کمال بلاغت، اس کے مطالب، فوائد، حل شبہات اور تاریخی، اخلاقی اور حکیمانہ معارف کا بیان کس طرح ناپید ہو جاتا ہے۔ نظام ختم ہوتے پر اس حکیمانہ خطبہ کی حیثیت ہذیان کی سی ہو جاتی ہے۔

۲۔ عام باتیں مرتب ہو کر اعلیٰ حقیقتوں تک پہنچاتی ہیں نظم کلام ہی ہے جو ان اعلیٰ حقیقتوں اور حکمتوں تک رہنمائی کرتا ہے، یہی اعلیٰ حقیقتیں اصل غایت ہوتی ہیں۔ جو شخص نظم کو نہیں سمجھتا وہ ان حقائق، حکمتوں اور غایتوں سے بے خبر رہتا ہے چنانچہ ایسے شخص کا حصہ اعتقاد و عمل میں کم رہ جاتا ہے صحیح عقاید کی آدمی کو خبر نہ ہو تو ممکن ہے کہ وہ پروردگار کے بارے میں سوءِ ظن میں مبتلا ہو جائے اور اس کے ساتھ اس کی صحیح نسبت قائم نہ رہے۔ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور یہ عقاید ہی سے پھوٹتے ہیں، اس لئے ان کی حکمتوں اور غایتوں سے کم علمی آدمی کے لے ان کی قرار واقعی بجا آوری کا دروازہ بند کر دے سکتی ہے مثلاً نماز میں ذکر کا فقدان یا زکوٰۃ میں تقویٰ کا فقدان ہو جاتے بعض اوقات یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ آدمی بالکلیہ ہی بعض اعمال کو ترک کر دے، جیسے بہت سے لوگوں سے اعمال حج کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ جس طرح قدردان اور علیم ہے اسی طرح بخشنے والا اور علم والا بھی ہے مگر جاننے والے اور نہ جاننے والے کیا برابر ہو سکتے ہیں؟

۳۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے جس طرح احکام کی تعلیم کے لئے بھیجا اسی طرح حکمت کی تعلیم کے لئے بھی مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے تزکیہ کو حکمت ہی کے ساتھ مربوط فرمایا اور اسے 'خیر کثیر' کا نام دیا ہے جو شخص اس حکمت سے غافل ہو جائے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقصد، اپنے دین کی تکمیل اور اپنے نبی کی تعلیم کو نظر انداز کرتا ہے اور حضورؐ کا قرار واقعی اتباع نہیں کرتا۔ اگرچہ ضروری نہیں کہ انسان غایتِ مطلوب کو پہنچ جائے مگر ہماری طرف سے اس کی کوشش لازم ہے۔ انسان کی کوشش کے مطابق ہی اسے

اپنا فضل اسے عطا کرتا ہے۔

۴۔ تاویل قرآن میں ہمارے ہاں بڑا اختلاف واقع ہوگیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہمارے عقائد مختلف ہوئے اور ہمارے دلوں کی اُلفت ختم ہوئی، پر نظم کی خاصیت ہے کہ وہ تمام امور کو ایک وحدت کی طرف پھیرتا ہے اور مفہوم کے اختلاف کو ختم کرتا ہے۔

اگر نظم کلام ظاہر ہوتا اور ہر سورہ کا مرکزی مضمون واضح طور پر سب کے سامنے ہوتا تو تاویل میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہوتا بلکہ سب ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہو جاتے اور سب کے منہ سے ایک ہی صدا بلند ہوتی۔

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ　　ایک بارآور درخت کے مانند جس کی جڑ زمین کے اندر دھنسی ہوئی اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا۔　　اور سب اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑو اور منتشر نہ ہو۔

لیکن جب صورت اس کے بالکل برعکس ہو چکی ہے اور لوگوں نے اس حبل اللہ المتین کو جس کی تعریف یہ ہے کہ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ۔　　جس کے اندر باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہوتا ہے نہ اس کے پیچھے سے۔

ٹکڑے ٹکڑے سمجھ رکھا ہے تو اس اختلاف سے نجات کی کیا شکل ہو سکتی ہے؛ حالت یہ ہے کہ ہر فریق اپنے اپنے خیال کے مطابق قرآن کی تاویل کر رہا ہے اور کلام کو اس کی صحیح سمت سے ہٹا کر جس وادی میں چاہتا ہے اس کو گھسیٹتے پھرتا ہے۔ ایسی حالت میں نظم کلام ہی کلام کے صحیح سمت کو متعین کرنے والی واحد چیز ہو سکتی ہے، اسی سے اہل بدعت وضلالت اور اصحاب تحریف کی کجرویوں کی اصلاح ہو سکتی ہے اور خدا کا کلام ان کی غلط تاویلوں اور تحریفوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

۵۔ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی سب سے افضل اور پائندہ تر، مضبوط ترین اور واضح ترین دلیل خود قرآن مجید ہے۔ ہم یہ بات بالبداہت جانتے ہیں کہ حسن ترتیب ایک بلیغ کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے ہم اعجاز قرآن پر بھی الیقین رکھتے ہیں۔ پس کیا ہم یہ پسند کریں گے کہ قرآن کو حسن ترتیب سے عاری قرار دیں؟ ہم اس کے معانی کے ربط اور اس کے لوازم میں غور و فکر کرنے کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؛ کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ ہم کسی بھی عقلمند و پختہ کار آدمی کے کلام کو ترتیب سے عاری کر کے خوش نہیں ہو سکتے؛ کتنی وضاحت ایسا

ہوتا ہے کہ ایک فصیح و بلیغ خطیب جو حسن بیان سے لوگوں کو فریفتہ کر لیتا ہے، کی قدر تمہارے دل سے اس لئے اٹھ جاتی ہے کہ اس نے ربطِ کلام سے غفلت برتی اور ایک وادی سے دوسری وادی میں بھٹکنے لگ گیا۔ وہ چاہے اپنے خطاب کو اس طرح ڈھیلا چھوڑ دینے کے لئے معذور ہو مگر یہ ردِّ عمل اس لئے ہوتا ہے کہ ایک بلیغ کلام سوءِ ترتیب کو برداشت ہرگز نہیں کرتا۔ اگر امر واقعہ یہی ہے تو اعجازِ قرآن پر ایمان رکھنے والے آدمی کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ وہ قرآن میں حسنِ نظم اور اس کی ترتیب کی پختگی کو ثابت کرے۔

امام رازی تفسیر سورہ انعام میں آیت وَ اِذَا جَاءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا کے تحت اس کے سبب نزول کی مختلف روایات پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

> "مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک وقت نازل ہوئی تھی۔ اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارہ میں یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ اس کا سبب نزول فلاں واقعہ ہے"۔

اس مشکل کا ذکر زیادہ وضاحت کے ساتھ انہوں نے سورہ حٰم سجدہ کی آیت وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا ........ (الآیہ) کے تحت کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

> "اس آیت کے شانِ نزول کے بارہ میں یہ روایت ہے کہ کفار نے از راہ شرارت کہا کہ قرآن مجید کسی عجمی زبان میں کیوں نہیں نازل کیا گیا تو یہ آیت اتری میرے نزدیک اس طرح کی باتوں سے قرآن مجید پر سخت اعتراض لازم آتا ہے اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن میں ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں باہمدگر کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ چیز قرآن مجید پر ایک بڑے اعتراض کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس اعتراض کے ہوتے ہوئے قرآن کو ایک معجزہ ثابت کرنا تو الگ رہا ہم اس کے ایک منظم کتاب ہونے کا بھی دعویٰ نہیں کر سکتے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ سورہ شروع سے لے کر آخر تک بالکل مسلسل کلام ہے"۔

اس کے بعد سورہ کے مضمون پر اجمالاً گفتگو کر کے فرماتے ہیں:۔

ہر شخص جس میں انصاف ہوگا وہ دیکھ سکتا ہے کہ اگر آیت کی یہ تفسیر کی جائے جو ہم نے کی ہے تو یہ سورہ شروع سے لیکر آخر تک ایسے منظم کلام کی صورت میں ڈھل جاتی ہے جس میں ایک خاص موضوع پیش نظر رکھا گیا ہو۔ اور یقیناً یہ تفسیر اس تفسیر سے کہیں بہتر ہوگی۔ جو لوگ بیان کرتے ہیں۔"

---

اقتباسات و ترجمہ
جناب خالد مسعود صاحب

# ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

بیسویں صدی، سائنس کی فتحمندیوں کی صدی ہے۔ انسان نے اس صدی میں مادی اعتبار سے اتنی کامیابی حاصل کی ہے جس کی مثال پہلے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔ مصر، یونان اور روما کی ترقی عظیم الشان رہی ہوگی، لیکن ہمارے زمانے میں انسان نے قدرت کی اس قدر طاقتیں مسخر کی ہیں کہ گزشتہ اقوام کی ترقیاں اس تسخیر کے سامنے حقیر معلوم ہوتی ہیں۔ انہی حیرت انگیز کامیابیوں کا نتیجہ ہے کہ ہمارے سائنسدان اپنے آپ کو خدا کی کائنات کا رازدان سمجھنے لگے ہیں۔ ایک غلط فہمی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ آج کے انسان نے قدرت کے پوشیدہ کارخانوں کا بھی کھوج لگا لیا ہے۔ اس غلط فہمی میں سائنسدان تو مبتلا نہیں، اس وجہ سے کہ ان کے ذوق جستجو کو مہمیز ملتی ہی اس خیال سے ہے کہ کائنات لامحدود ہے اور انسان کا علم ابھی اتنا نہیں کہ اس کا احاطہ کر سکے اور انسان اگر کسی وقت مطمئن ہو کے بیٹھ رہے تو قدرت کے خزانے دبے کے دبے رہ جائیں گے۔ اس غلط فہمی میں مبتلا وہی لوگ ہیں جو سائنس کے کرشموں سے مرعوب ہیں۔ جن کے نزدیک خلابازوں کا کرۂ زمین کے گرد گردش کر لینا اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات میں کسی خدا کی خدائی نہیں چلتی۔ اگر کوئی خدا موجود ہوتا تو خلائی مسافروں کا رستہ روک لیتا۔ ان لوگوں میں سے بیشتر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ سائنس نے فطرت کے اسرار سے پردہ اٹھا دیا ہے اور اب لوگوں کے لئے اہل مذہب سے کچھ حاصل کرنے کی کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔

سائنس سے مرعوبیت کا یہ مقام محض ایک نادانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی یہ کائنات ایک بحر ناپیدا کنار ہے۔ موجودہ دور کی سائنس نے یا بحیثیت مجموعی انسان نے اس کا کھوج لگا کر جتنا علم حاصل کیا ہے، اس کی حیثیت وہی ہے جو سمندر کے مقابل میں ایک قطرے کی ہوتی ہے۔ سائنس کے انکشافات اگر سو گنا زیادہ بھی ہو جائیں، جب بھی یہ دعویٰ کہ کائنات کا معمہ حل کر لیا گیا ہے

اسی طرح مضحکہ خیز ہوگا۔ جیسا یہ اب ہے انسان کی اس تہی دامنی پر اصرار صرف مذہب ہی کو نہیں بلکہ سائنس کے انکشافات خود اس پر شاہد ہیں۔

آسمانوں کی بات تو خیر دور کی ہے، انسان سے سب سے زیادہ اگر کوئی امید ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ یہ اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین سے بخوبی واقف ہوگا۔ لیکن حقیقت اس سے کوسوں دور ہے۔ زمین کے متعلق بھی انسان کا علم اتنا ہی محدود ہے جتنا دوسری کائنات کے متعلق ہے اور اس کا ثبوت جدید تحقیقات نے بہم پہنچایا ہے۔ عالمی ارضی طبیعیاتی سال کی تحقیقات کے نتائج سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ انسان اب تک جسے اپنی منزل سمجھے ہوئے تھا نہ صرف یہ کہ وہ اس کی منزل نہیں تھی بلکہ وہاں سے منزل کا راستہ بھی نہیں پہچانا جا سکتا تھا۔

آج سے پانچ سال پہلے اقوام متحدہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ۱۹۵۷ء کو سائنس کی تحقیقات کا سال قرار دیا جائے۔ اور کرہ ارض کے بارے میں اس سال میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔ اس سال سے عام طور پر لوگ عالمی ارضی طبیعیاتی سال کے نام سے واقف ہیں۔ ان تحقیقات میں حصہ لینے کے لئے ۶۶ اقوام تیار ہو گئیں اور کرۂ زمین کے تمام گوشے تجربات کے لئے مخصوص کر لئے گئے۔ ان مقامات کی تعداد، جہاں تجربات کئے گئے، چار ہزار ہے۔ اس تحقیقاتی منصوبہ کے تحت آباد و غیر آباد زمین، کہسار و ریگ زار، قطبین اور دور دراز جزائر، سمندر اور فضا غرضیکہ ہر ضروری مقام پر تجربات ہوئے اور جدید ترین آلات استعمال میں لائے گئے۔ اس منصوبہ کی تحقیقات کے پورے نتائج مرتب کرنے میں تو سائنس والوں کو مزید کئی سال درکار ہوں گے۔ لیکن جو دلچسپ معلومات اس سلسلہ میں سامنے آئی ہیں، ان کا مختصر سا خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

قطب جنوبی کے اردگرد کا علاقہ انٹارکٹیکا کہلاتا ہے۔ اب تک سیاحوں نے اور جغرافیہ والوں نے اس سرزمین کے جو نقشے تیار کئے تھے، جدید تحقیقات نے انہیں بالکل غلط ثابت کیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اب تک جس چیز کو انٹارکٹیکا کی زمین سمجھا جاتا رہا ہے، وہ در اصل زمین نہ تھی بلکہ محض برفانی سمندر تھا۔ قطب جنوبی کی اصل سرزمین جغرافیہ والوں کی بتائی ہوئی حدود کی نسبت بہت مختصر ہے۔ انٹارکٹیکا کی برف کے متعلق یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ دنیا بھر کی برف کا نوّے فیصد ہے سردی کے موسم میں جب سورج نظر نہ آنے کی وجہ سے یہ براعظم تاریک ہوتا ہے اس وقت قریب قریب

روشن علاقوں کی نسبت یہاں کا درجہ حرارت ۹۰ درجے کم ہوتا ہے۔ اندرون ملک کی سطح مرتفع کا درجہ حرارت اس موسم میں منفی ۱۲۵ درجے ہوتا ہے اس شدید سردی کی وجہ سے دوسرے علاقوں اور قطب جنوبی کے درمیان ہوا کے دباؤ میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ یہاں دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طوفان چلتے ہیں۔

اب تک انسان سطح سمندر پر چلنے والی سرد اور گرم روؤں سے واقف تھا، جن کا پانی سمندر میں اسی طرح بہتا ہے جس طرح خشکی پر دریا بہتے ہیں۔ عالمی ارضی طبیعیاتی سال کی تحقیقات سے ان روؤں کے مخالف سمت میں چلنے والی روؤں کا انکشاف ہوا ہے۔ یہ رویں سطح سمندر سے آدھ آدھ میل نیچے چلتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی کرامویل رو ہے جو بحر الکاہل میں مغرب سے مشرق کو، خط استوا کے ساتھ ساتھ بہتی ہے۔ یہ رو ۲۰۰ میل چوڑی اور سات ہزار میل لمبی ہے اور امریکہ کے سب سے بڑے دریا مسس پی کی نسبت ہزار گنا زیادہ پانی لے جاتی ہے۔

جدید تحقیقات کے نتیجہ میں انسان ایک نئی دولت سے بھی واقف ہوا ہے۔ یہ دولت سمندروں کی تہ میں بکھرے ہوئے ایک کارآمد دھات مینگنیز کے گولے ہیں۔

بظاہر مضبوط علاقے ان تحقیقات کے بعد خطرے میں محسوس ہونے لگے ہیں۔ مثلاً جزائر ہوائی کے متعلق یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ وہ چار انچ یومیہ کے حساب سے حرکت کر رہے ہیں اور عین ممکن ہے کہ ان کی یہ حرکت ان کی غرقابی کا باعث بن جائے۔ کیلی فورنیا، جو اس وقت شمالی امریکہ کا ایک حصہ ہے، امریکہ سے کٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کے برعکس خلیج کیلی فورنیا اور بحیرہ احمر میں نئی زمین ظاہر ہو رہی ہے۔



سمندروں کے متعلق اب تک انسان جتنا کچھ جانتا تھا، نئی تحقیقات کے بعد وہ بالکل ہیچ معلوم ہونے لگا ہے۔ جدید معلومات کے مطابق بحر اوقیانوس کی تہ سلسلہ ہائے کوہ سے بھری ہوئی ہے۔ ایک سلسلہ کوہ جو شمالاً جنوباً واقع ہے، تین سو سے بارہ سو میل تک چوڑا ہے۔ جزائر آئس لینڈ اور جزائر ازورس دراصل اسی پہاڑ کی چوٹیاں ہیں جو سطح آب کے اوپر ابھر آئی ہیں۔ ان پہاڑوں میں بعض حصے آتش فشاں ہیں۔ ان کی آتش فشانی کا مظہر سطح آب پر کے بلبلے اور جزائر کے گرم پانی کے چشمے ہیں۔ ان غرقاب پہاڑوں کی سطح کہیں کہیں پھٹی ہوئی ہے اور یہ شگاف بعض اوقات تیس تیس میل چوڑے

ہیں۔ سلسلہ کوہ کے دامن میں سطح آب سے تقریباً تین میل نیچے ایک ہموار میدان ہے جس میں کہیں کہیں چوٹیاں ابھری ہوئی ہیں۔

سطح سمندر کے نیچے کے جن سب سے بڑے سلسلہ کوہ سے سائنسدان واقف ہوئے ہیں وہ ایک چالیس ہزار میل لمبا پہاڑ ہے جو کرۂ ارض کا حلقہ کئے ہوئے ہے۔ اس کی چوٹیاں بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کے سمندروں میں جزائر کی صورت میں نظر آتی ہیں۔

بحر الکاہل کی تہ میں بحر اوقیانوس کی نسبت ہموار علاقہ زیادہ پایا گیا ہے۔ اس میں چار دراڑیں ہیں جو مشرقاً غرباً سطح زمین کے ۵ فی صد حصہ پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ دراڑیں تیس تیس میل چوڑی، تین تین ہزار میل لمبی ہیں اور سطح سے دس ہزار فٹ گہری ہیں۔ اسی طرح جنوبی بحر الکاہل میں کئی کھائیاں ہیں جن میں سے بڑی کھائی ۱۴۰۰ میل لمبی اور ۳۵۰۰۰ فٹ گہری ہے۔

ایک عجیب و غریب انکشاف یہ ہوا ہے کہ بحر الکاہل کا فرش گھڑی کی سوئیوں کے مخالف سمت میں گردش کر رہا ہے۔ کرۂ ارض پر اس گردش کے نتائج کیا مرتب ہوتے ہیں؟ یہ سوال ابھی زیر مطالعہ ہے۔

عالمی ارضی طبیعیاتی سال میں حاصل شدہ معلومات کی یہ ایک معمولی مثال ہے۔ لیکن یہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ کہ انسان کا علم محدود بہ محدود ہے۔ وہ اپنے آپ کو فطرت کا جتنا بڑا دانشمند بھی سمجھتا ہے مگر حق بات یہی ہے کہ رب کے پیدا کئے ہوئے لشکروں کو سب سے زیادہ جاننے والا خود پروردگار ہی ہے۔ کوئی مخلوق اس کائنات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔

---

سلسلۂ مذاکرہ
...ین احسن اصلاحی

# قرآن کی رو سے ترقی کا مفہوم

"قوموں کے عروج و زوال کی بحث میں قرآن مجید کی رُو سے ترقی کا کیا مفہوم ہے؟ اس سے مراد کیا صرف مادی و سیاسی ترقی ہے یا صرف روحانی ترقی یا دونوں؟ جو قوم زیادہ سے زیادہ علاقہ مغلوب کرے یا مادی وسائل اس کے پاس زیادہ ہوں تو یہ چیز اس کی عظمت کی دلیل بتائی جاتی ہے بلکہ ایک نظریہ کے مطابق یہ چیزیں ایک قوم کے قابل تقلید ہونے کی دلیل بھی ہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟"

**جواب:** - قرآن مجید کی رُو سے حقیقی ترقی وہ ہے جو خدائی بندگی اور اس کے احکام و ...امین کی کامل فرمانبرداری و اطاعت کے ساتھ ہو۔ اسی ترقی سے روح اور جسم دونوں کے حقیقی مقتضیات پورے ہو...تے ہیں اور یہی ترقی مشترک طور پر تمام بنی نوع انسان کے لئے رحمت و برکت کے دروازے کھولتی ہے۔ قرآن میں ...متعدد ایسی قوموں کا ذکر ہوا ہے جنھوں نے مادی اعتبار سے بڑی ترقی کی لیکن عین اپنے دورِ ترقی میں وہ عذابِ الٰہی ...مستحق ٹھہریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی ترقی کے پہلو بہ پہلو انھوں نے روحانی ترقی نہیں کی۔ اس روحانی ترقی سے ...محروم ہونے کے سبب سے ان کے اجتماعی و سیاسی کردار میں وہ اعتدال و توازن نہ پیدا ہو سکا جو ایک عادلانہ ...نظام کے قیام کے لئے ناگزیر چیز تھا۔ اس بنیادی کمزوری کی وجہ سے بہت جلد ان کے اجتماعی و سیاسی کردار ...میں ایسی خرابیاں نمودار ہو گئیں جن کو قدرت کا نظام زیادہ وقت تک نہیں برداشت کرتا بلکہ ایک خاص حد تک ...مہلت دینے کے بعد ایسے کردار کی حامل قوموں کو فنا کر دیتا ہے۔

قرآن مجید نے امتِ مسلمہ کی تشکیل کا جو نظام پیش کیا ہے اس میں مادی و سیاسی ترقی کو اس نے ...روحانی ترقی کے ساتھ بالکل ہم آہنگ رکھا ہے۔ اس نے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق کا ایک ...نہایت متوازن و معتدل نظام بنی نوع انسان کو عطا فرمایا ہے جس کو اختیار کر کے وہ حقیقی سعادت

یا ترقی حاصل ہو سکتی ہے جو دنیا و آخرت دونوں کی صلاح و فلاح کی ضامن ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس نظام کے چار جزو ہیں (عقائد، عبادات، قانون اور اخلاق۔ یہ چاروں جزو اس نظام کے اجزائے لاینفک ہیں۔ ان میں سے اگر کسی ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو سارا نظام یا بالکل درہم برہم اور بے برکت ہو کر رہ جائے گا۔ علاوہ بریں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اس کے اجزائے ترکیبی میں اخلاق کا جو عنصر شامل ہے وہ صرف انفرادی یا محدود معاشرتی اخلاق ہی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کے اندر وہ اجتماعی و سیاسی اخلاق بھی داخل ہے جو کسی قوم کے عروج و زوال میں اصلی عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس نظام میں عقائد کا جو حصہ ہے وہ ہم کو زندگی کے بارے میں صحیح نظریات و تصورات دیتا ہے۔ ان نظریات و تصورات سے وہ انفرادی و اجتماعی اخلاق وجود میں آتا ہے جو اصل مقصود ہے اور جس پر ہماری دنیوی و اخروی سعادت کا انحصار ہے۔ عبادات کا نظام ان نظریات و تصورات کو اور اسی کے ساتھ ساتھ اس اخلاق کو جو ان نظریات سے وجود میں آتا ہے استحکام اور پختگی بخشتا ہے۔

اگر کسی معاشرہ کی تربیت ٹھیک ٹھیک اسلام کے پیش کردہ اس نقشہ کے مطابق ہو جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے تو وہ دنیا اور آخرت دونوں میں اس سعادت کا ضامن ہے جو انسان کی تخلیق کی غرض و غایت ہے۔

لیکن اس زمانہ میں مصیبت یہ ہے کہ اسلام کے اس پورے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اگر اس وقت خود مسلمانوں کا جائزہ لیجیے جو اسلام کے حامل ہونے کے مدعی ہیں تو معلوم ہو گا کہ کسی خطہ میں بھی آج ان کی یہ حالت نہیں ہے کہ وہ اجتماعی حیثیت سے پورے اسلام کو اپنائے ہوئے ہوں (کچھ لوگوں کے اندر ہے سب کے اندر نہیں) اگر عبادات کا اہتمام ہے تو وہ اسلام کے قانون اور اس کے نظام اخلاق سے نا آشنا اور محروم ہیں۔ عقائد کا حال اکثریت کے اندر یہ ہے کہ عوام کے عقائد پرانی بدعات سے زنگ خوردہ ہو چکے ہیں اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے عقائد کی جڑیں نئی تعلیم نے اکھاڑ کے رکھ دی ہیں۔ اسلامی قانون اور اخلاق کے لحاظ سے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ اس کے خال خال اجزاء تو ہمارے اندر ضرور پائے جاتے ہیں (وہ بھی زندگی کے

بعض خاص دائروں کے اندر) باقی سارا قانون اور پورا نظام اخلاق ہم نے کتابوں میں لکھ کر کیڑوں کے حوالہ کر رکھا ہے۔

ان حالات کے اندر وہ حقیقی ترقی جو دین و دنیا دونوں کی فلاح و سعادت کی ضامن ہے بالکل خارج از بحث ہے۔ اس کا مظاہرہ کبھی پہلے مسلمانوں نے کیا تھا اور اب ...... بھی وہی اس کا مظاہرہ کر سکتے تھے لیکن یہ جب ہو سکتا ہے جب وہ اپنے پورے دین کو اپنائیں۔ اس کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ کچھ مسلمان نماز اور حج کا اہتمام کر لیں۔

یورپ، امریکہ اور روس وغیرہ ممالک میں آج جو ترقی پائی جاتی ہے وہ ہے تو اسی اجتماعی و سیاسی اخلاق و کردار کا ثمرہ جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے لیکن جس طرح ہم مسلمانوں نے اسلام کے بعض اجزا کو لے لیا ہے بقیہ کو چھوڑ رکھا ہے اسی طرح ان قوموں نے اجتماعی و سیاسی کردار سے متعلق اسلام کے بعض اجزا کو اپنا لیا ہے اور بقیہ کو چھوڑ رکھا ہے۔ ان کے اندر محنت، وقت کی قدر و قیمت، تلاش علم، شوق جستجو، بلند ہمتی، ایثار، خدمت خلق اور جمہوریت وغیرہ کی بعض وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں جو اسلام کا ورثہ ہیں اور انہی خوبیوں کے نتیجہ میں ان کو موجودہ ترقیاں حاصل ہوئی ہیں لیکن چونکہ یہ قومیں اسلامی نظام زندگی کی دوسری چیزوں سے محروم ہیں، اس وجہ سے ان کی یہ ساری ترقیاں بنی نوع انسان کے لیے رحمت کے بجائے عذاب بنتی جا رہی ہیں اور ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اب اس عذاب کے پھٹ پڑنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

مسلمانوں میں سے جو لوگ ان قوموں کی تقلید کی دعوت دیتے ہیں وہ اگر ان کی ان خوبیوں کی تقلید کی دعوت دیں جو فی الواقع ان کی ترقیوں کا باعث ہوئی ہیں تو ہمیں اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا، یہ خوبیاں تو اسلام کا ورثہ ہیں اور یہیں سے ان کو ملی تھیں لیکن اگر ان کی تقلید کے معنی ان کی برائیوں اور گمراہیوں میں بھی ان کی تقلید ہے (جیسا کہ فی الواقع ہے) تو اس چیز سے ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس لیے کہ ان قوموں کی یہی برائیاں اور گمراہیاں تو ان کی اور ان کے تمام مقلدین کی بربادی کا سبب بننے والی ہیں۔

---

## تقریظ و تنقید

# ابن ماجہ اور علم حدیث

تالیف: مولانا محمد عبدالرشید نعمانی

شائع کردہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی۔

اس کتاب کے مؤلف مشہور و معروف عالم حدیث مولانا عبدالرشید نعمانی ہیں جن کی شخصیت کا تعارف تحصیل حاصل ہے۔ سنن ابن ماجہ ہی سے متعلق ان کی ایک کتاب عربی زبان میں شائع ہو چکی ہے، جو اگرچہ ہماری نظر سے نہیں گزری لیکن خیال یہ ہے کہ اس میں سنن ابن ماجہ پر دقیق علمی بحثیں ہوں گی۔ محترم مؤلف نے زیر نظر کتاب امام محمد ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات مرتب کرنے کے لیے لکھی ہے اور ضمناً اس میں بھی حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کی سنن کا تعارف کرایا ہے۔

اس کتاب کا نام سن کر اس کے مندرجات کا جو اندازہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں امام صاحب کی زندگی کے تفصیلی حالات، طلب علم کے لیے ان کی قربانیوں، ان کے علمی کارناموں، علم حدیث کے لیے ان کی خدمتوں اور مشقتوں اور ان کے تلامذہ وغیرہ کا تفصیلی بیان ہوگا۔ لیکن کتاب کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب ہمارے اندازے سے کلی طور پر مختلف ہے۔

۳۰۶ صفحات کی اس کتاب میں امام صاحب کے حالات زندگی صرف تیس صفحات تک محدود ہیں اور ان کو پڑھ کر بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ امام رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کیسے گزری اور علم حدیث کی انھوں نے کیا کچھ خدمت کی۔ محترم مصنف نے بجا بجا یہ تحریر فرمایا ہے کہ انھیں امام صاحب کے متعلق تاریخوں میں کچھ مواد نہیں ملا۔

قارئین کو خیال ہوگا کہ فاضل مصنف نے کتاب کے باقی صفحات سنن ابن ماجہ پر تنقید و تبصرہ میں صرف کیے ہوں گے، لیکن انھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ کتاب میں سنن ابن ماجہ کا تذکرہ بھی صرف ۸

صفحات میں کیا گیا ہے۔ اس تذکرہ کی نوعیت تعارف کی ہے، تنقید و تبصرہ کی نہیں اس لیے اسکے پڑھنے کے بعد بھی سنن کے بارے میں معلومات کی تشنگی باقی رہتی ہے۔

باقی کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ تقریباً ایک سو صفحات میں حفاظ و مشائخ حدیث اور واکو علم حدیث کا بیان ہے۔ اور اسی قدر صفحات میں ایک اہم موضوع حدیث اور تدوین حدیث کی تاریخ پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ کتاب کے موخر الذکر حصہ میں محترم مصنف نے حدیث کی ضرورت اور حدیث کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کی کوششوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے کتابت حدیث کا تسلسل ثابت کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے لے کر امام ابن ماجہؒ کے زمانہ تک کے حدیث کے نوشتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس تذکرہ کو پڑھ کر منکرین حدیث کے اس پروپاگنڈے کا مسکت جواب مل جاتا ہے کہ حدیث کی کتابت حضورؐ کی وفات کے دو تین صدیاں بعد میں ہوئی یہ بحث ترتیب کتاب کے لحاظ سے اگرچہ ضمناً آئی ہے لیکن اصل موضوع بحث کی نسبت اتنی زیادہ پھیلی ہوئی ہے کہ اس پر غالب آگئی ہے۔

اس کتاب میں کچھ اور اہم بحثیں بھی ہیں۔ مثلاً منکرین حدیث ہی کے اس پروپاگنڈے کا جواب بھی اس میں ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حدیث کو کوئی اہمیت نہ دیتے تھے اور صرف گنتی کی چند حدیثیں ان کے علم میں تھیں۔ محترم مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ امام موصوف اپنے زمانہ کے علمائے حدیث میں نہایت اونچا مقام رکھتے تھے اور انھوں نے ایک مجموعہ حدیث بھی مرتب فرمایا۔

طلب حدیث کے لیے مسلمانوں نے جو سفر کیے اور اس کے لیے جو مشقتیں اٹھائیں، ان کے بارے میں بھی کافی معلومات دی گئی ہیں۔ انھیں پڑھ کر اپنے زمانہ کی کسل مندی اور حصول علم سے بے رغبتی پر رونا آتا ہے۔

کتاب کے آخری ایک سو صفحات افراد و قبائل، بلاد و امصار اور کتب کے اشاریہ پر مشتمل ہیں۔ تاریخ اسلام کے ابتدائی عہد کی حکومت کے تین نقشے بھی دیے گئے ہیں۔ آخر میں اغلاط نامہ ہے۔ کتاب بڑے سائز کی ہے، سفید کاغذ پر چھپی ہے، مجلد ہے اور قیمت آٹھ روپے ہے۔　(ر۔م)

## ★ بیمۂ زندگی اسلامی نقطۂ نظر سے

تالیف : ابوسلمان الہندی

شائع کردہ: مکتبہ سعدیہ کراچی

صفحات ۱۲۶ قیمت ۲ روپے

اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بیمہ اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے اور علمائے دین کی طرف سے بیمہ خصوصاً بیمۂ زندگی کے سلسلہ میں جو اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔
کتاب کا آغاز "علمائے کرام کے فتووں اور بیانات پر ایک نظر" سے ہوتا ہے۔ اس باب میں علماء کے متضاد بیانات نقل کرکے مصنف نے یہ دکھایا ہے کہ علماء بیمہ کے موافق و مخالف دونوں ہی قسم کی رائیں رکھتے ہیں۔ گویا اس مسئلہ کو نزاعی بناکر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کتاب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد بیمہ کو ناجائز سمجھنے والے علماء کے دلائل پر بحث کی گئی ہے۔ مصنف کی رائے میں ان علماء کو بیمہ کے نظام سے پوری طرح واقفیت نہیں تھی اس وجہ سے انھوں نے اس کے متعلق غلط رائے قائم کرلی۔
علماء کے فتووں یا بیانات سے قطع نظر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس موضوع پر قلم اٹھانے والوں کو سب سے پہلے یہ بات واضح کرنی چاہیے کہ معاشرہ میں بیمہ کی ضرورت پیش کیوں آئی ہے؟ بیمہ کا نظام کن معاشی حالات کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے۔ اور وہ کون سی وجوہ ہیں جن کی بنا پر آدمی زندگی کا بیمہ کرانے کی ترغیب پاتا ہے؟ ہماری رائے یہ ہے کہ ان بنیادی سوالوں کو اس کتاب میں بالکل نظرانداز کیا گیا ہے جس سے نفس مسئلہ جوں کا توں باقی رہا ہے۔

ہمارے نزدیک بیمہ کے نظام کو موجودہ دور کے اس معاشی نظام نے جنم دیا ہے، جو خدا کی ہدایت سے ہٹ کر قائم ہوا ہے۔ اس معاشی نظام کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر خود غرضی حد اعتدال سے بڑھ گئی ہے اور غلط نظام اخلاق و سیاست کے تحت پرورش پاکر اس خود غرضی نے وہ گل کھلائے ہیں کہ زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ اس کے فاسد نتائج سے بچ سکا ہو۔ انسانوں کا باہمی تعلق اگر محبت و اعتماد، رافت و رحمت اور اخلاص و ایثار کی بنا پر تھا تو اس خود غرضی نے ان صفات کے بجائے تنگ نظری، بداندیشی، بخل و حرص اور نفس پرستی کی بنیادوں پر معاشرے کی تعمیر کی۔ اس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ موسیقی، رقص، شراب، سینما، قمار اور تفریح و آسائش کے مقاصد کے لیے مال صرف کرنا تو ایک پیدائشی حق سمجھ لیا گیا۔ لیکن اپنے فاضل سرمائے کو ضرورت مند لوگوں کی امداد کے لیے صرف کرنے پر اکسانے والی کوئی چیز باقی نہ رہی۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ زیادہ وسائل رکھنے والوں میں استحصال کا جذبہ پیدا ہوا اور انہوں نے کم تر وسائل رکھنے والوں کے حقوق پر بھی دست اندازی شروع کر دی۔ اجارہ داری کے رجحان کے پیچھے بھی یہی جذبہ کام کرتا ہے۔

جس معاشی و معاشرتی نظام کے اثرات یہ ہوں، وہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملازمت پیشہ اور کم حیثیت لوگ اپنا اور اپنے بال بچوں کا مستقبل کس طرح بہتر بنائیں اور استحصال پسند طبقے کی دست اندازیوں سے کس طرح محفوظ رہیں۔ اس کا علاج ان لوگوں نے یہ سوچا کہ زندگی اور جائداد کا بیمہ کرا یا جائے تاکہ آڑے وقت میں بال بچوں کو کھانا میسر آ سکے۔ گویا بیمہ تمدن کے ایک روگ کے علاج کے طور پر شروع کیا گیا اور یہی مختلف مراحل سے گزرتا ہوا مزید ترقی یافتہ شکل میں ہم تک پہنچا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں بیمہ کے نظام کی کیا واقعی ضرورت ہے؟ اسلامی نظامِ معیشت کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے معاشروں کے برعکس اسلامی معاشرہ کی بنیاد خود غرضی اور نفس پرستی کے بجائے خدا خوفی اور اخوت و ایثار پر رکھی گئی ہے۔ اسلام نے جو تعلیم دی ہے اس کے مطابق آدمی جائز طریقہ ہی پر کما سکتا اور خرچ کر سکتا ہے۔ کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے اور تفریح و آسائش کے نام پر غیر ضروری روپیہ بہانے کی ذہنیت کو یہاں ختم کیا گیا ہے ان تمام طریقوں پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں جن سے لوگ دوسروں کا خون چوس چوس کر کروڑپتی بنتے ہیں، دولت کو سمیٹنے کے بجائے معاشرہ میں گردش دینے کی تعلیم دی گئی ہے، حاجتمندوں کی اعانت یہاں امیروں کا فریضہ ہے۔ اندریں حالات ایک اسلامی معاشرے میں بیمہ کے نظام کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نظام میں اگر اس کی ضرورت باقی رہتی ہے تو وہ بیمہ کو اسلامی ثابت کرنے والوں کو بتانی چاہیے۔

علمائے کرام کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے مصنف نے قمار، سود، مضاربت اور تحکم فی القدر تمام پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ یہاں ان تمام بحث پر تنقید کرنے کا تو موقع نہیں لیکن چند ضروری چیزوں کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

مصنف نے یہ غلط فہمی کی جگہ دینے کی کوشش کی ہے کہ بیمہ کے پیچھے احسان و صاحبت روائی اور

تقاون عمل اظہر جیسے اچھے محرکات کام کرتے ہیں، حالانکہ قمار، سود وغیرہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ دلیل اگر مان لی جائے تو غریبوں میں رقم تقسیم کرنے کی غرض سے جوا کھیلنا یا سودی کاروبار چلانا عین نیکی ٹھیرتا ہے۔ شاید مصنف کو یہ معلوم نہیں کہ ایام جاہلیت میں فی الواقع اسی مقصد کے لیے جوا کھیلا جاتا تھا لیکن اسلام نے ہوئے کے ان اچھے محرکات کا لحاظ کر کے اسے حلال نہیں رکھا بلکہ اس کے نظام کی غلطی کی بنا پر اس کی ممانعت کر دی۔

مصنف کی یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ بیمہ کا اصول ماننے سے تقدیر پر ایمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور بیمہ محض ایک بچت کی اسکیم ہے۔ شاید وہ یہ بات بھول رہے ہیں کہ اگر بیمہ صرف بچت کی ایک اسکیم کا نام ہوتا تو انہیں اسے اسلامی ثابت کرنے کی زحمت نہ گوارا کرنی پڑتی۔ یہ تکلف کرنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بیمہ بچت کے ساتھ یہ گارنٹی بھی دیتا ہے کہ اگر بیمہ دار کی موت آگئی تو اس کی اولاد کو وہ رقم بھی ادا کر دی جائے گی جو بیمہ دار اپنی زندگی میں ادا نہیں کر سکا تھا۔ بیمہ کی اس گارنٹی ہی سے آدمی خدا کی رزاقیت یا تقدیر پر بھروسہ کرنے کے بجائے بیمہ کمپنیوں کا سہارا تلاش کرتا ہے۔ بیمہ کے نظام کا یہ پہلو نہ ہو تو اس کی کمپنیوں کے دفاتر شاید چند دن سے زیادہ کھلے نہ رہ سکیں۔

تبصرہ نگار کو اس کتاب سے نقصان کی ایک نادر تعریف بھی معلوم ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ نقصان اس ذہنی یا خیالی کیفیت کو کہتے ہیں جو جیب خالی ہونے کے پس منظر میں موجود ہوتی ہے۔ مصنف شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ احساس بھی دلا دیا ہے کہ یہ ذہنی تکلیف صرف مہاجنی سود ادا کرتے وقت ہوتی ہے۔ بنکوں کا انٹرسٹ لیتے دیتے وقت نہیں ہوتی۔ اسی لیے وہ انٹرسٹ کو 'متین منافع' کا نام دیتے ہیں۔

مصنف کو بارہا حقائق سے صرف نظر کرنا پڑا ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کی تو ضرورت نہیں البتہ ان کی اس بات کے جواب میں کہ قمار سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ بیمہ سے نہیں پیدا ہوتیں، اتنا عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیمہ کی رقم سمیٹنے کی نیت سے عزیزوں اور رشتہ داروں کو قتل کرنے اور جائدادوں کو آگ لگانے کی نوبت تو کئی بار آئی ہے اور جہاں تک بیمہ کمپنیوں کا تعلق ہے ان کی بھی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی حادثہ پر ایسی رپورٹ حاصل کریں جس کے نتیجہ میں انہیں کم سے کم نقصان ہو۔ اب معلوم نہیں مصنف کو کس طرح کی خرابیوں کی تلاش ہے؟

یہ کتاب نیوز پرنٹ پر معمولی لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

(ع ح م)

# ★ عیسائی معتقدات تعلیم انجیل کی روشنی میں

تالیف : صدرالدین

شائع کردہ : احمدیہ انجمن اشاعت اسلام - لاہور

موجودہ عیسائیت کے مزعومات و معتقدات کے خلاف خود بائبل سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ فاضل مؤلف نے اس ہتھیار سے فائدہ اٹھا کر یہ واضح کیا ہے کہ عیسائی مذہب کا دار و مدار جن بنیادی عقائد پر ہے تعلیمات انجیل کی روشنی میں وہ سب غلط ثابت ہوتے ہیں مثلاً انجیل خود شاہد ہے کہ کفارہ کی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے نہیں، نجات کا انحصار خدا کی فرماں برداری پر ہے، مسیح بشر اور خدا کے رسول تھے، خدا نہ تھے۔ خدا کا بیٹا، کا محاورہ بعض فرمانبردار لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ کہ انجیل حضرت مسیحؑ کا جو کردار پیش کرتی ہے وہ خدائی کردار نہیں ہو سکتا۔

فاضل مؤلف نے خود اپنی جانب سے بہت کم لکھا ہے، زیادہ تر انجیل کی آیتیں پیش کرتے چلے گئے ہیں۔ اس لیے ان کی تحریر میں متانت و سنجیدگی ہے۔ البتہ کئی جگہ یہ سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے کہ بعض حوالوں کے درج کرنے سے ان کا مقصد کیا ہے۔ خود اس کتاب کے لکھنے کا مقصد بھی مصنف نے واضح نہیں کیا اور کتاب کے دیباچہ میں مقصد تالیف پر ایک لفظ درج نہیں۔ دوسرے کے صرف عنوان کتاب ہی سے آدمی اس مقصد کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ دیباچہ میں مصنف نے مسیحیوں پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات جتلا کر انھیں اپنے موجودہ رویہ پر نظرثانی کرنے کا جو مشورہ دیا ہے، ایک منصف مزاج آدمی اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

فاضل مؤلف اگر یہ بات بھی پیش نظر رکھتے کہ عیسائیوں کے نزدیک تثلیث اور کفارہ اسرار ربانی ہیں اور مسیح کامل انسان اور کامل خدا ہے تو کتاب کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ بائبل میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ ساری نسل انسانی گنہگار ہے، درست نہیں۔ رومیوں باب ۵ آیت ۱۲ میں لکھا ہے۔

"پس جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے سبب سے موت آئی اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔ اس لیے کہ سب نے گناہ کیا۔"

مصنف نے یہ تو واضح کر دیا ہے کہ اپنے ذاتی اعمال کے لحاظ سے سب لوگ گنہگار نہیں ہیں لیکن پیدائشی طور پر گنہگار ہونے کے مسیحی عقیدہ کے بارہ میں کچھ نہیں لکھا۔

اس کتاب کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بائبل کے غلط سلط حوالے بلا اظہار کراہت نقل کر دیے گئے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب عیسائیوں کے مزعومات کی تردید کے لیے لکھی گئی ہے اور مصنف نے اپنی جانب سے اس میں کچھ زیادہ نہیں لکھا تاہم یہ ان کی بڑی فروگزاشت ہے کہ خدا کے ایک جلیل القدر پیغمبر کے دامن کو صاف کرنے کی انھوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔

بہر حال مسیحیت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب مفید ہوگی۔ ۱۲۰ صفحات کی یہ کتاب اچھے کاغذ پر ٹائپ میں شائع ہوئی ہے۔ (م - ا - س ا)

## ★ پیام انسانیت

تالیف : مولانا ابوالحسن علی ندوی

ناشر : ادارہ نشریات اسلام رحیم یار خان

یہ پمفلٹ محترم مصنف کی پانچ تقریروں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ملے جلے اجتماعات میں کیں اور جن میں دنیا کی موجودہ مشکلات کا حل پیغمبروں کے بتائے ہوئے طریقہ کی پیروی کو بتایا محترم مصنف کا سوز اور اخلاص ایک ایک فقرے سے ظاہر ہوتا ہے۔ زبان نہایت شگفتہ اور آسان ہے جسے معمولی استعداد کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے۔ ۹۲ صفحات کے اس پمفلٹ کی قیمت ایک روپیہ ہے۔

(خ - م)

## ★ فقر محمدی

مصنف : نیاز الدین نیاز جالندھری

'فقر محمدی' پنجابی نظم کی کتاب ہے۔ جسے مصنف نے تبلیغ دین کے مقصد سے لکھا ہے۔ یہ کتاب عوام الناس کے لیے ہے اور مصنف نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے بعض

سبق آموز واقعات، چند آیات کا مفہوم اور تصوف کے کچھ احوال عام فہم انداز میں نظم کیے ہیں۔
مصنف کا جوش و جذبہ قابل داد ہے لیکن تبصرہ نگار کو اس نظم میں نہ زبان کی پختگی محسوس ہوئی ہے اور نہ نظم کا معیار کچھ اونچا معلوم ہوا ہے۔ کتاب معمولی کاغذ پر چھپی ہے۔ اس کی ضخامت ۱۵۲ صفحات ہے لیکن قیمت درج نہیں۔ اسے مصنف کے ہاں سے "رحمانیہ ٹیکسٹائل ملز جھنگ روڈ لائل پور پوسٹ بکس ۱۸" کے پتہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔　　(خ - م)

## ★ اسلامی پیغام کے اولین علمبردار

تصنیف: علامہ سید محب الدین الخطیب

ترجمہ: محمد اسلم سیف فیروز پوری فاضل عربی

ناشر: مکتبہ سعیدیہ فیض آباد براستہ تلمبہ ضلع ملتان

اس کتاب کے مصنف علامہ محب الدین خطیب مصر کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ "اسلامی پیغام کے اولین علمبردار" مشاجرات صحابہ کے بارے میں ان کے ایک مقالہ کا ترجمہ ہے۔ اس مقالہ میں فاضل مصنف نے عربوں کے مخصوص خطیبانہ انداز میں یہ بیان کیا ہے کہ صحابہ کرام کے آپس کے تعلقات حب فی اللہ کا مظہر تھے نفس پرستی سے یہ پاکیزہ ہستیاں اجتناب کرتی تھیں اور جن لوگوں نے ان کے اختلافات ظاہر کرنے کے لئے واقعات گھڑے ہیں، انھوں نے محض اپنی صحابہ دشمنی کی بنا پر ایسا کیا ہے فاضل مصنف نے اس سلسلہ میں جنگ جمل، مسئلہ تحکیم اور مسئلہ خلافت حضرت علیؓ کا ذکر خاص طور پر کیا ہے اور شیعوں کی پھیلائی ہوئی روایات کی تغلیط کر کے ان مسائل کی ایسی توجیہہ کی ہے جس سے صحابہ کے ایمان و اخلاق پر کوئی حرف نہ آئے۔

ہمیں مصنف کے خیالات سے بیشتر اتفاق ہے اور خصوصاً ہم ان کی اس بات کو بہت وزن دیتے ہیں کہ اب تک عموماً مؤرخین نے تاریخ اسلام کو غلط سلط روایات سے منزہ کر کے قلمبند نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص غلط سے غلط روایات کا سہارا لے کر بھی تاریخ کا چہرہ مسخ کر ڈالتا ہے تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا، حالانکہ اس کے بیان کو قبول کرنے سے عقل سلیم بھی اِبا کرتی ہے۔ ایک مستند تاریخ اسلام کی تدوین فی الواقع ایک اہم ضرورت ہے۔

یہ کتاب جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے، صرف ایک مقالہ کا ترجمہ ہے اس لئے یہ توقع رکھنا کہ علامہ خطیب صاحب نے اس میں مؤرخانہ نقطہ نظر سے تحقیق کی ہوگی، درست نہیں البتہ اس کتاب میں تحقیق سے زیادہ خطابت موجود ہے اور بعض

اوقات طوالتِ کلام کا احساس بھی ہوتا ہے۔

ترجمہ عموماً رواں ہے، کہیں کہیں ثقیل بھی ہو گیا ہے۔ ۴۰ صفحات کی نیوز پرنٹ پر چھپی ہوئی یہ کتاب ایک روپیہ میں ملتی ہے۔ (خ۔م)

---

(بقیہ صفحہ ۴) ساڑھے تین لاکھ الجزائری مسلمان شہید ہوئے۔ اس معاہدہ میں فرانس نے اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ الجزائر کے مستقبل کا فیصلہ خود الجزائری کریں گے۔ ان کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے عنقریب ایک ریفرینڈم کرایا جائے گا۔ اور جب تک یہ رائے معلوم نہیں ہوتی، اس وقت تک ایک عبوری حکومت کام کرے گی۔ معاہدہ کی رو سے الجزائری حکومت اپنے ملک کے داخلی و خارجی مسائل طے کرنے میں آزاد ہوگی البتہ صحرا میں تیل کے کنوؤں اور بعض فوجی اڈوں پر فرانس کا قبضہ بدستور رہیگا اسی طرح فرانسیسی فوج کا الجزائر سے انخلا، تین سال کے عرصہ میں ہوگا اور الجزائری حکومت الجزائر کے یورپی باشندوں کو شہری حقوق دے گی۔

---

معاہدہ کی شرائط سے بظاہر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فرانس نے جاتے جاتے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں کامیاب بھی رہا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر معاہدہ کے نتائج کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کرنا مشکل ہے۔ یہ مستقبل ہی بتلائے گا کہ الجزائریوں کے حق میں یہ معاہدہ کیسا رہا البتہ اس معاہدہ سے خصوصاً اس حقیقت کے معلوم ہونے کے بعد کہ اس کی تحریک فرانس کی طرف سے ہوئی ہے، یہ بات بالکل صاف ہو گئی ہے کہ الجزائری مسلمانوں نے اپنے زور بازو سے فرانس کو الجزائر میں عمل دخل رکھنے سے روک دیا ہے۔ انھوں نے بڑے دگرگوں حالات میں جنگ آزادی کے کٹھن کام کو بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ انھوں نے جس مردانہ عزیمت اور صبر و ثبات کے ساتھ یہ جہاد جاری رکھا اس کی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔

اس جہاد کا ایک اہم پہلو یہ رہا ہے کہ اس کی حیثیت محض ایک بغاوت کی نہ تھی۔ جو ملک کے ایک گوشے سے اٹھتی ہے یا ملک کا کوئی خاص گروہ اس کو برانگیختہ کرنے والا ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو فرانس کو لمبے عرصہ تک اپنی ساڑھے چار لاکھ آزمودہ کار فوج کے ساتھ اس کا مقابلہ نہ کرنا پڑتا۔ یہاں صورت

حال یہ تھی کہ ملک کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک الجزائری مسلمانوں کا ہر فرد اپنے دل میں آزادی کی تڑپ پاتا تھا اور فرانس کی استعمار پسندی کا طلسم توڑنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار تھا۔ ہمارے نزدیک مجاہدین کی کامیابی میں اس حقیقت کا بڑا ہاتھ ہے کہ الجزائریوں نے بحیثیت قوم اس کے لیے جدوجہد کی۔

---

مسلمانانِ عالم کی طرف سے جہاد کے کٹھن سالوں میں مجاہدین کے ساتھ جو تعاون ہوا ہے وہ اتنا قلیل ہے کہ مسلمانوں کی ایک بیماری کا پتہ دیتا ہے۔ حدیث شریف میں ساری دنیا کے مسلمانوں کو جسدِ واحد قرار دیا گیا ہے۔ اور ان کی ایک مطلوبہ صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اگر اس جسد کے ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسد اس کے کرب سے تلملا اٹھتا ہے۔ اس جہاد میں یہ بات واضح ہوئی ہے کہ مسلمان ممالک کے نزدیک اپنے سیاسی علائق اتنے محترم ہیں کہ ان کی وجہ سے یہ اپنے مسلمان بھائیوں سے کوئی خاطر خواہ تعاون کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ مسلمانوں میں اسلامی اخوت اور یک جہتی کا کس قدر فقدان ہے اور دوسری قومیں اس معاملہ میں کتنی بلند ہیں اس کا اندازہ آج سے تیس سال قبل فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کی جھڑپوں میں بھی ہوا تھا۔ جب یہودیوں کی امداد کے لیے دنیا بھر کے یہودیوں نے مل کر دس لاکھ پونڈ چندہ دیا۔ مگر مسلمانانِ عالم نے جن کی تعداد یہودیوں سے پچیس گنا زیادہ ہے، مل کر صرف تیرہ ہزار پونڈ فراہم کیے۔ قوم کے اس جمود پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

---

الجزائری مسلمانوں کے اس جہاد نے محکوم قوموں کو استعماری طاقتوں سے نجات حاصل کرنے کا صحیح طریقہ بتا دیا ہے۔ یہ کتنا حقیقت کو جھٹلانا ہوگا کہ فرانس کا ناک میں دم کر کے اسے پسپائی پر مجبور کرنے میں تیغ و تفنگ کی کثرت کا ہاتھ تھا۔ الجزائری مجاہدین نے یہ جنگ محض ایمان و عزیمت اور ثبات و استقلال کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر لڑی، مادی وسائل ان کے پاس محض برائے نام تھے۔ اگر مادی وسائل بھی انھیں حاصل ہوتے تو جنگ کا نتیجہ شاید بہت پہلے نکل چکا ہوتا۔ کوئی عجب نہیں کہ الجزائر کا یہ جہادِ حریت دوسری محکوم قوموں کے لیے بھی مشعلِ راہ ثابت ہو اور اس کے نتیجہ میں استعمار کا خاتمہ ہو۔

اب جب کہ الجزائر اپنے مسائل ومعاملات کے طے کرنے میں خود مختار ہے، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ اپنی پالیسیوں کا رہنما کس چیز کو بناتا ہے اسلام کو یا غیر اسلام کو۔ ہمارے نزدیک اب وہ مرحلہ آگیا ہے جس میں الجزائری مسلمانوں کو یہ ثابت کرنا ہے کہ انھوں نے ساڑھے تین لاکھ مجاہدین کی قربانی اسلام اور صرف اسلام کے لیے دی تھی۔ ہماری دعا ہے کہ الجزائر آزاد قوموں میں بلند مقام حاصل کرے اس کی مشکلات دور ہوں، اسے خوشحالی اور امن نصیب ہو اور یہ شمالی افریقہ میں اسلام کا علمبردار بن کر رہے۔

---

مئی ۱۹۶۲ء

# ماہنامہ میثاق لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ : ساٹھ پیسے
سالانہ : چھ روپے (بارہ شلنگ)
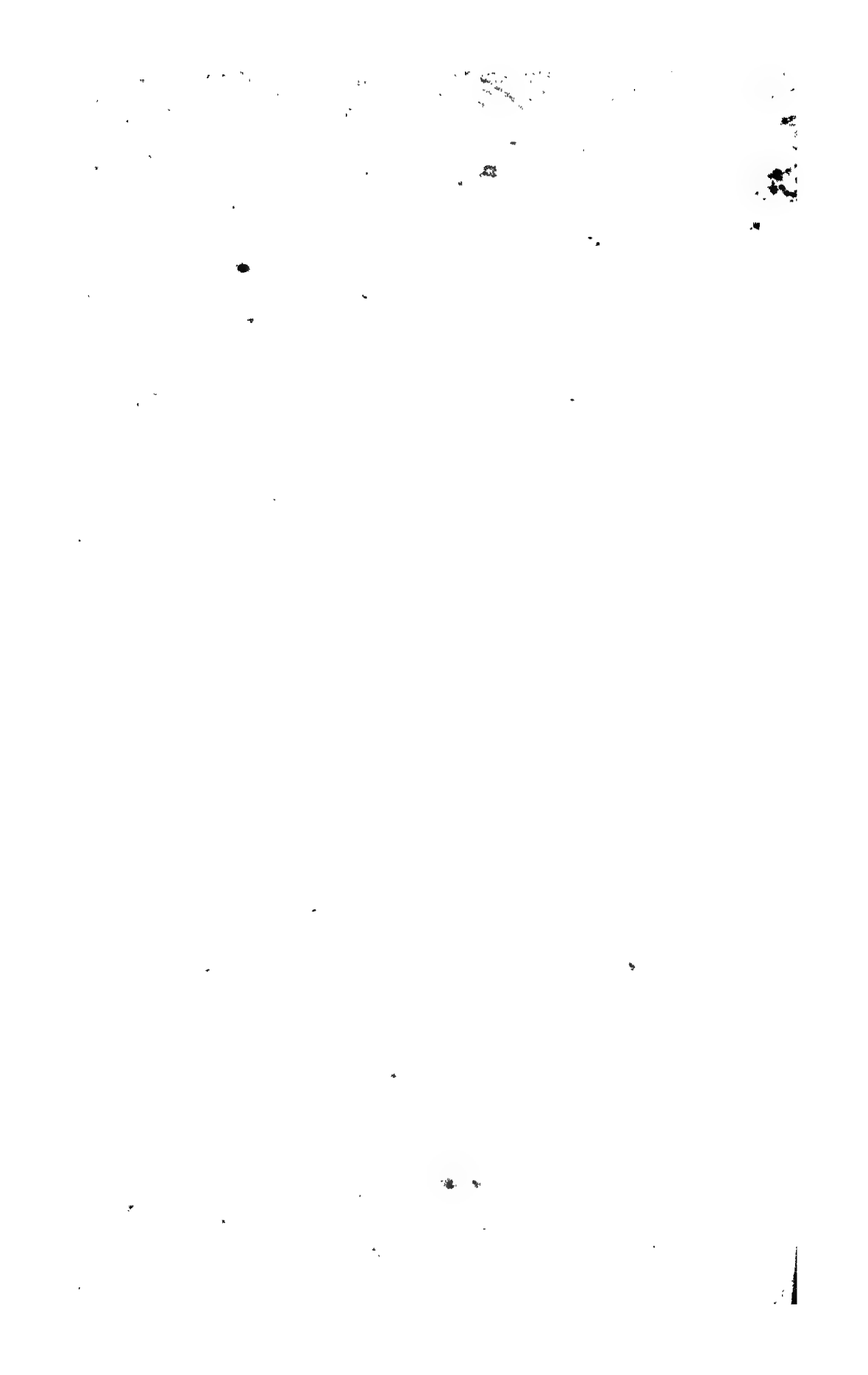
# ماہنامہ میثاق، لاہور

جلد ۶ | ذیقعدہ، ذوالحجہ ۱۳۸۱ھ | شمارہ ۵

## فہرست مضامین



ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیل زر کا پتہ
منیجر "الفرقان"
کچہری روڈ لکھنو

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ
منیجر ماہنامہ "میثاق"
رحمان پورہ ـــ اچھرہ
لاہور ـ ۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تذکرہ و تبصرہ

ہمارے عزیز بھائی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے منٹگمری شہر میں کچھ عرصہ سے ایک حلقہ مطالعہ قرآن جاری کر رکھا ہے۔ اس کے زیر اہتمام ہفتہ وار درس قرآن بھی ہوتا ہے اور وقتاً فوقتاً اسلامی مباحث پر علمی و تحقیقی لیکچروں کے لئے باہر کے اصحاب علم کو بھی دعوت دی جاتی ہے۔ اس کی دعوت پر دو مختلف موقعوں میں دو لیکچر — تدبر قرآن کے آداب و شرائط — اور — قرآن کا فلسفہ تاریخ — کے عنوانوں سے راقم کو بھی دینے کے موقعے نصیب ہوئے۔ ان دونوں لیکچروں میں شہر کے ذہین طبقہ کی ایک اچھی تعداد نے شرکت کی اور تقریروں سے پوری دلچسپی لی۔ یہ تقریریں ٹیپ ریکارڈ پر محفوظ بھی کر لی گئی ہیں، اور حلقہ کی طرف سے افادہ عام کی غرض سے ان کی اشاعت کی بھی سکیم ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ شہر کے تعلیم یافتہ طبقہ کی دلچسپی برابر اس حلقہ کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور قرآن سے استفادہ کرنے والوں کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے نہایت مفید اور بابرکت کام کی بنیاد ڈالی۔ یہ دور اسلام کی غربت کا دور ہے۔ اس دور میں اللہ کے جس بندے سے دین کی جو خدمت بھی بن آئے، اس میں اپنا تن من دھن لگا دے۔ آج چھوٹی چھوٹی خدمتوں کا بھی ان شاء اللہ وہ اجر ملے گا جو کل بڑی بڑی خدمتوں کے لئے مخصوص تھا۔ شرط صرف قربانی اور اخلاص نیت کی ہے۔۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کام کے ساتھ ساتھ ایک اور نہایت ہی مفید اور قابلِ تقلید کام کی بنیاد رکھی ہے۔ یہ ہے ایک اسلامی دار الاقامہ کا قیام۔ اس دار الاقامہ کا مقصد ان طلبہ کے لئے اسلامی تعلیم و تربیت کی تمام ضروری سہولتیں مہیا کرنا ہے جو مقامی کالج میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ہم عرصہ سے یہ محسوس کر رہے تھے اور ہمارے اس احساس میں دوسرے بہت سے اربابِ فکر و نظر بھی شریک ہیں کہ اس زمانہ میں جبکہ دین اور دنیا دونوں کی جامع درسگاہیں مفقود ہیں اور ان کا قائم کرنا اور کامیابی کے ساتھ چلانا بحالاتِ موجودہ تقریباً محال ہے تمدان کے بدل کے طور پر یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ ہر بڑے شہر میں ایسے ہوسٹل قائم کئے جائیں، جن میں کالجوں کے طلبہ کے لئے رہائش کی سہولتیں بھی فراہم ہوں اور ذی علم اور دیندار اساتذہ کی نگرانی میں ان کو اسلامی تعلیم و تربیت سے بھی آراستہ کرنے کی کوشش کی جائے یہ ایک بیچ کی راہ ہے جو موجودہ حالات میں تعلیمی اداروں کے مضر اثرات کو کم کرنے اور ان کے اندر سے سعید روحوں کو چھانٹ کر ان کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو اسلام کی راہ پر لگانے کے لئے اختیار کی جا سکتی ہے۔

---

اس وقت جدید تعلیم و تہذیب کے جادو نے ہماری پوری قوم کو بالکل مسحور کر رکھا ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس امرِ واقعی سے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ ان کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آج بھی ایسے کتنے نوجوان موجود ہیں جو اسلامی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے اندر شدید تشنگی رکھتے ہیں، لیکن ان کے سامنے مشکل یہ ہے کہ ان کے اپنے کالجوں اور ہوسٹلوں کے ماحول میں ان چیزوں کے حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں اور شہروں میں ایسا کوئی دوسرا نظم نہیں، جس سے وابستہ ہو کر وہ اپنی موجودہ تعلیمی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ اپنی دینی تعلیم و تربیت کی یہ تمنا بھی پوری کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم و تربیت کے افسوں نے جن کو ہلاک کر چھوڑا، وہ تو ہلاک ہیں ہی، لیکن جن کی بڑا ابھی فطرت ابھی تک زندہ ہے ان کو بھی ہم نے ہلاک ہونے ہی کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔ حالانکہ تھوڑی سی نمی بھی ان کے لئے فراہم ہو جاتے تو خدا کے فضل سے ان کے اندر زرخیزی کی بڑی صلاحیتیں ودیعت ہیں۔

---

ڈاکٹر صاحب کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ انہوں نے ہماری یہ دیرینہ تمنا بھی پوری کرنے کے لئے ایک قدم اٹھایا۔ اگرچہ ابھی یہ قدم ایک بالکل ابتدائی قدم ہے لیکن تو تخم ہے

کہ شہر کے اہلِ خیر حضرات نے اگر اس ہوسٹل کی اسلامی قدر و قیمت پہچانی تو ڈاکٹر صاحب اس کو ایک معیاری ہوسٹل کے درجہ پر انشاء اللہ بہت جلد پہنچا دیں گے۔ فی الحال اس مقصد کے لئے ایک موزوں مکان کرایہ پر لے لیا گیا ہے۔ اسلامی ذہن رکھنے والے چند بیرونی اور چند مقامی طلبہ نے اس میں داخلہ لے لیا ہے مفید اسلامی کتب پر مشتمل ایک کتب خانہ اس کے اندر قائم کر دیا گیا ہے۔ عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم کے لئے دو استادوں کی خدمات پہلے سے حاصل تھیں اور اب ہمارے مخدوم و محترم دوست مولانا عبد الغفار حسن صاحب طلبہ کی تعلیم و تربیت اور حلقۂ مطالعہ قرآن کی نگرانی کے لیے مستقلاً لائلپور سے منٹگمری منتقل ہو گئے ہیں۔ مولانا کی صحبت دین کے علم و عمل کے طالبوں کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ طلبہ اور اہل شہر ان کے فیض سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔

---

اس تقریب سے ہم سب سے پہلے تو اپنے ملک کے دینی خدمت گزاروں کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے شہروں کے طلبہ کے لئے بھی اسی نمونے کے ہوسٹل قائم کریں، خاص طور پر بڑے شہروں میں ان کی ضرورت بھی شدید ہے اور ان کی کامیابی کے امکانات بھی زیادہ ہیں۔ اس سلسلہ میں طریق تربیت و تعلیم یا طریق کار سے متعلق اگر کسی کو مشورہ یا رہنمائی کی ضرورت محسوس ہو، تو وہ مولانا عبد الغفار حسن صاحب سے حلقہ مطالعہ قرآن، چوک کنواں نور والا منٹگمری کے پتہ پر رجوع کر سکتا ہے۔

دوسری گذارش ہم ملک کے اہل خیر حضرات سے کریں گے کہ اس زمانہ میں دین کی تعلیم کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے یہ طریقہ جتنا مفید ہو سکتا ہے، دوسرا کوئی طریقہ شاید ہی مفید ہو سکے۔ یہ ہوسٹل دین و دنیا دونوں کے جامع مدارس کے بالمقابل بہت تھوڑے مصارف سے قائم ہو سکیں گے اور نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام کے سانچہ میں ڈھالنے اور ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کو دین کی طرف مصروف کرنے میں ان کا رول انشاء اللہ نہایت شاندار رہیگا۔ اس وجہ سے جو اصحاب ثروت اس کام میں تعاون کرینگے ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے مال سے دین کی نہایت مفید خدمت انجام دینگے اور اس پر اللہ تعالے کے ہاں اجر کے مستحق ہوں گے۔

ہماری تیسری گذارش طلبہ اور ان کے سرپرستوں سے ہے کہ جہاں کہیں اس قسم کے ہوسٹل بنیں

میسر آئیں وہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں جو طلبہ منٹگمری میں ہیں یا وہاں قیام کر کے ان کے لیے تعلیم حاصل کرنا ممکن ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کی بڑی ہی ناشکری کریں گے اگر اس انتظام سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو یہ بات کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ گو اللہ کا دین ہم میں سے کسی کا محتاج نہیں ہے، لیکن ہم اس کے محتاج ضرور ہیں، اگر ہم نے سب کچھ سیکھا، لیکن خدا کے دین ہی کو نہیں سیکھا تو ہمارا سارا سیکھنا اور پڑھنا ہمارے لیے صرف وبال بنے گا۔

## ۲

ہمیں پرویز صاحب کے ایک پرزور حمائتی کی طرف سے ایک مراسلہ موصول ہوا ہے جس میں پہلے تو ان علماء پر بڑی لے دے کی گئی ہے جنہوں نے پرویز صاحب پر کفر کا فتوےٰ لگایا ہے، پھر ہم سے باصرار یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم ان کے مراسلہ کو میثاق میں چھاپیں اور پوری ایمانداری کے ساتھ اس پر اپنی رائے ظاہر کریں، اگر پرویز صاحب ہمارے نزدیک بھی اسی طرح کافر ہیں جس طرح دوسرے علماء کے نزدیک وہ کافر ہیں تو ہم بھی علماء کے ہمنوا ہو کر ان کے کفر کا اعلان کریں اور اگر ہم اس فتوے کے بعد بھی پرویز صاحب کو بدستور مسلمان سمجھتے ہیں تو اخلاقی جرأت سے کام لے کر اس فتوے کی پوری طاقت سے تردید کریں۔

اس مراسلہ کے علاوہ ہمیں "کافر گری" کے عنوان سے خود پرویز صاحب کی طرف سے بھی ایک پمفلٹ موصول ہوا ہے۔ اس کے بھیجنے سے بھی ان کا مقصود غالباً یہی ہوگا کہ ہم اس پر اظہار رائے کریں۔ لیکن اس وقت نہ تو ہم اس فتوے پر کوئی رائے ظاہر کرنا چاہتے نہ پرویز صاحب کے پمفلٹ اور صاحب مراسلہ کے مراسلہ پر۔ ان چیزوں پر کسی اظہار رائے کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ کام ہم بعد میں کریں گے اور انشاء اللہ نہایت تفصیل سے کریں گے، اس اظہار رائے کے بجائے اس وقت ہم پرویز صاحب اور ان کے حمائتیوں کی خدمت میں اپنے چند مشورے عرض کرنا چاہتے ہیں، اُمید ہے کہ وہ ان مشوروں کو اخلاص پر مبنی سمجھیں گے اور قبول کریں یا نہ کریں لیکن ان پر غور ضرور کریں گے۔

پہلی گذارش یہ ہے کہ وہ یہ موقف اختیار نہ کریں کہ علماء کو کسی پر کفر کا فتوےٰ لگانے کا حق نہیں ہے۔ اس امر میں تو شبہ نہیں کہ اسلامی نظام میں کسی کے کفر وارتداد پر اس کو سزا دینا حکومت کا کام ہے۔ لیکن یہ بتانا کہ کیا چیز کفر ہے اور کیا چیز اسلام ہے ہر حال میں علماء ہی کی ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری

ان پر اللہ اور رسول کی طرف سے ڈالی گئی ہے۔ اگر وہ اس کو ادا نہ کریں گے تو اس کے لئے وہ عند اللہ ذمہ دار ٹھہریں گے۔ یہ ذمہ داری یوں تو ان پر ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن خاص طور پر اس زمانہ میں تو اس کے تنہا حامل وہی ہیں، اس لئے کہ اس دور میں مسلمان حکومتوں کو لوگوں کے کفر و ایمان کے معاملہ سے کوئی تعلق باقی ہی نہیں رہ گیا ہے، وہ یا تو سیکولرازم کے پردے میں غیر جانبدار بن کر بیٹھ گئی ہیں یا پھر مغربیت کے زیر اثر آزادی و بے قیدی کی سرپرستی کر رہی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر علماء بھی لوگوں کی ہدایت وضلالت کے معاملہ سے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھ جائیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلے گا کہ نبی اُمی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت شیطان اور اس کی ذریات کی صرف ایک چراگاہ بن کر رہ جائے۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ اس فتوے کے جواب میں تاویل بازی اور مغالطہ انگیزی کی جو روش اختیار کی گئی ہے یہ بالکل غلط ہے، علماء نے جو فتویٰ دیا ہے وہ پرویز صاحب کی کسی مبہم عبارت یا کسی مغلق تحریر یا مجمل قول پر مبنی نہیں ہے کہ اس کی توضیح وتشریح کی ضرورت پیش آئے۔ وہ یہ فتویٰ پرویز صاحب کے ایسے عقاید ونظریات پر مبنی ہے، جن کو وہ ایک مدت دراز سے بیان کر رہے ہیں (بلا مبالغہ ان کی وضاحت میں پرویز صاحب نے سیکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات سیاہ کئے ہیں) صرف بیان ہی نہیں کئے ہیں۔ بلکہ بڑے بشد و مد سے لوگوں کو ان کی دعوت بھی دی ہے۔ صرف دعوت ہی نہیں دی ہے بلکہ ان کے پندار میں مسلمان قوم کے تمام اسلاف واخلاف کو جاہل اور بیوقوف بھی ٹھہرایا ہے۔ جو داستان لَتنے تکرار واعادہ کے ساتھ سُنی اور سنائی جا چکی ہو اور جو تنقید و تردید کے بھی تمام مراحل سے گذر چکی ہو، اس کے متعلق جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ پرویز صاحب کا مطلب یہ نہیں بلکہ یہ ہے تو اس پر ہمدردی کے بجائے آدمی کو غصہ آتا ہے۔ اس قسم کی روش صرف وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو سخت بزدل ہوتے ہیں۔ بہادر آدمی اس طرح کے حالات میں صرف دو ہی راہیں اختیار کرتا ہے اگر اسے اپنے عقائد ونظریات پر جزم ہوتا ہے تو ان پر ڈٹ جاتا ہے، اسے اس بات کا کچھ فکر نہیں ہوتا کہ وہ کن سے کٹ رہا ہے اور کن سے جڑ رہا ہے اور اگر اس پر اپنے نظریات وعقائد کی غلطی واضح ہو جاتی ہے تو برملا اپنی غلطی کا اقرار کر لیتا ہے۔ اس امر کی اسے ذرا پروا نہیں ہوتی کہ دوست اور دشمن اسے کیا کہیں گے۔ یہ روش صرف بے کردار لوگ اختیار کرتے ہیں کہ دلوں کے اندر تو تمام شکوک کے

کرتے ہیں لیکن جب کسی سخت قسم کی گرفت میں آجاتے ہیں تو لوگوں کی آنکھوں میں تاویلات کی دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسری ساری باتوں کو اس وقت ایک طرف رکھئے، یہ بتائیے کہ آپ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ایک حجت شرعی ہونے کے منکر ہیں یا نہیں؟ اور حضورؐ کے احکام و ہدایات کو وقتی اور ہنگامی احکام کا درجہ دیتے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے (اور اثبات کے سوا آپ کس شکل میں اس کا جواب دے سکتے ہیں؟) تو میں صاف کہتا ہوں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا دوسرے لفظوں میں انکار ہے۔ قادیانی حضرات نے ختم رسالت کا انکار کرکے رسالت کا انکار کیا، آپ حضرات نے سنت کا انکار کرکے۔ راستے دونوں کے بظاہر دو ہیں۔ لیکن منزل ایک ہی ہے۔ آخر جو باتیں آپ لوگوں نے اتنے شد و مد سے کہی ہیں ان کی تاویل کس کس طرح سے کریں گے اور ان تاویلات بارده سے فائدہ کیا؟ اس طرح کی تاویلات کس کو مطمئن کر سکیں گی؟ میں سچ سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے پرویز صاحب سے کبھی کوئی پرخاش نہیں ہوئی۔ پہلے ان کے ساتھ میرے دوستانہ مراسم رہ چکے ہیں، مجھے اب بھی ان کے ساتھ ہمدردی ہے۔ میں ان کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انکے دل و دماغ کو بدل دے اور ان کے زبان و قلم سے اسلام کی خدمت لے۔ لیکن ان کے بارے میں اپنے ان ہمدردانہ جذبات کے باوجود میں یہ امر واقعی بھی واضح کئے دیتا ہوں کہ میں نے جب جب انکی کوئی تحریر پڑھی ہے (اور اب ایک رسالہ کے ایڈیٹر ہونے کے سبب سے مجھے اکثر ان کی تحریریں طوعاً یا کرہاً پڑھنی پڑتی ہیں) تو میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ گو بظاہر وہ صرف حدیث کے منکر ہیں لیکن حقیقت میں وہ رسالت کے منکر ہیں۔ جو شخص سنت کا منکر ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا رسالت پر ایمان کیا معنی رکھتا ہے؟ قرآن قرآن وہ بہت پکارتے ہیں لیکن ان کے ہاتھوں قرآن حدیث سے بھی زیادہ مظلوم ہے۔ انہوں نے عربی لغت اور عربی گرامر سب اپنے گھر میں بیٹھ کر گھڑی ہے۔ ہر قاعدہ اور ہر ضابطہ سے بے نیاز ہو کر محض اپنی خواہشات کے تحت تاویل کرنے کے معاملہ میں ان سے زیادہ بے باک آدمی میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ قادیانی حضرات تو کس گنتی میں ہیں، انہوں نے تو اکثر معاملات میں اپنے ڈانڈے صوفیہ سے ملا دیئے ہیں۔

ان وجوہ سے ہمارے نزدیک ان دوستوں کی یہ کوشش تو بالکل فضول ہے کہ خرافات کے

اس مزبلہ پر تاویل کے پردے ڈالیں۔ البتہ اگر ان میں ہمت ہے تو اس کو بالکل دفن کر دیں اور از سر نو ایمان و اسلام کی صحیح خدمت کا آغاز کریں۔

ہم ان دوستوں کو یہ مشورہ بھی دیں گے کہ وہ اپنے ذہنوں سے یہ مغالطہ بالکل نکال دیں کہ تکفیر کے فتووں سے آدمی ملت کا ہیرو بن جایا کرتا ہے۔ سرسید وغیرہ جن کا پرویز صاحب نے حوالہ دیا ہے تکفیر کے فتووں سے ہیرو نہیں بنے۔ بلکہ اپنی شاندار قومی خدمات کے سبب سے ہیرو بنے۔ دینی معاملات میں ان سے جو بے اعتدالیاں ہوئیں وہ ہرگز کسی فتنہ پروری اور فرقہ سازی کے شوق میں نہیں ہوئیں، بلکہ محض حمایت اسلام کے جوش میں صادر ہوئیں۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا، پورے اخلاص کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی حمایت و مدافعت میں لکھا۔ لیکن چونکہ ان کو دین کا پورا علم نہیں تھا اس وجہ سے انہوں نے اس راہ میں بہت سی ٹھوکریں بھی کھائیں۔ جن پر کچھ علما نے ان کی تکفیر کی۔ لیکن مسلمانوں کی حمایت میں چونکہ ان کی خدمات نہایت شاندار تھیں، ان کا خلوص ہر شبہ سے بالاتر تھا، ان کی ساری زندگی قوم کے لئے ایثار و قربانی کا ایک مرقع تھی۔ اس وجہ سے عام طبائع پر ان کی تکفیر شاق گذری، تاہم ان کے مخصوص مذہبی نظریات کو تھوڑے سے مغرب زدہ بے خبروں کے سوا کسی نے قبول نہیں کیا۔

اب موازنہ کیجئے کہ کجا سرسید اور کجا پرویز صاحب۔ پہاڑ اور گلہری میں کیا نسبت۔ ان کے صحیفۂ اعمال میں بجز اس کے کہ کتاب فروشی کی، انکار سنت اور انکار رسالت کا فتنہ اٹھایا، دین باطل کی تبلیغ کی، کچھ بے خبر مسلمانوں کو گمراہ کیا، اور کون سا کارنامہ درج ہے۔ لیکن اپنی ذات کے ساتھ حسن ظن ملاحظہ ہو کہ محض اس دلیل سے اپنے آپ کو اسلام کا بہت بڑا ہیرو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کفر کے فتوے ابو حنیفہؒ، احمد بن حنبل اور اسمٰعیل شہید پر بھی لگ چکے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک ہر کشتۂ تیغ حسینؓ بن جاتا ہے، اگرچہ اس کا سر چوری اور ڈکیتی ہی کی راہ میں قلم کیا جائے۔ عجیب و غریب منطق قادیانی حضرات بھی بہت استعمال کرتے ہیں اور ہم کو ان حضرات کی اس بوالفضولی پر ہمیشہ ہنسی آئی ہے۔

دراز دستیٔ ایں کوتہ آستیناں بیں۔

---

پرویز صاحب نے مختلف گروہوں کے علماء کے ایک دوسرے کے خلاف فتووں کا جو ریکارڈ شائع کیا ہے، یہ بھی ان کے حق میں کچھ سودمند نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مختلف مسلکوں کے غالی مولویوں نے گروہی تعصبات و نزاعات کے جوش میں ایک دوسرے کے خلاف فتوے دے ڈالے ہیں۔ لیکن اس سے اس فتوے کی اہمیت ذرا کم نہیں ہوتی جو انہوں نے پرویز صاحب کے خلاف دیا ہے۔ کچھ بریلویوں کا دیوبندیوں کے خلاف یا کچھ دیوبندیوں کا بریلویوں کے خلاف کوئی فتویٰ دے دینا الگ چیز ہے اور کم و بیش ایک ہزار علما کا، جن میں مسلمانوں کے ہر مسلک فقہی و کلامی کے علما شامل ہیں، پرویز صاحب کے کفر پر اجماع کر لینا ایک مختلف چیز ہے۔ اس قسم کا اجماع قادیانیوں کے سوا کسی کے کفر پر بھی اس ملک میں نہیں ہوا ہے۔ اس وجہ سے ہم پرویز صاحب اور ان کے ساتھیوں کو نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس معاملہ کی نزاکت پر نہایت سنجیدگی سے غور کریں، یہ نہ خیال کریں کہ اس دورِ کفر پرستی میں کوئی ان کا کیا بگاڑ لے گا۔ بگاڑ تو بیشک کوئی ان کا کچھ نہیں لے گا۔ لیکن یہ پیشینگوئی ہم کئے دیتے ہیں کہ اگر انہوں نے دانشمندی کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا تو وہ قادیانیوں کی طرح مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے بالکل کٹ جائیں گے اور یہ بات ہمارے لئے بھی غم انگیز ہوگی اور ان کے لئے بھی نہایت افسوسناک ہوگی۔

آخر میں ہم یہ بات بھی واضح کئے دیتے ہیں کہ پاک و ہند کے جن علماء کے اس فتوے پر دستخط ثبت نہیں ہیں، ان کو اس فتوے سے الگ خیال کرنا محض ایک مغالطہ ہے۔ اگر کچھ لوگوں نے اس پر دستخط نہیں کئے ہیں تو اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ فتووں پر دستخط کرنا ان کے رجحان طبیعت اور ذوق کے خلاف ہے یا یہ ہے کہ اس دور میں اس چیز کو وہ کچھ زیادہ مفید نہیں پاتے ہیں۔ میرے جیسے لوگوں کے لئے یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ فتوے لکھنا یا اس پر دستخط کرنا میں نے اپنے منصب سے ہمیشہ ایک اونچی چیز سمجھا ہے لیکن یہ بات کہنے میں مجھے ذرا حجاب نہیں کہ پرویز صاحب کے خیالات و عقائد کو میں نے ہمیشہ کفر و ضلالت سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دے کہ وہ زندگی کا صحیح رُخ اختیار کریں اور دین سے ناواقفوں کے لئے فتنہ نہ بنیں۔

---

## ۳

لکھنؤ سے ایک ہفت روزہ "ندائے ملت" کے نام سے نکلا ہے۔ اس کے ایڈیٹر مولانا عتیق الرحمٰن اور اس کے نگران مولانا ابوالحسن علی اور مولانا محمد منظور نعمانی ہیں۔ یہ پرچہ اپنی خصوصیت و اہمیت کے اعتبار سے اس بات کا حقدار ہے کہ اس کا ذکر ان صفحات میں کیا جائے۔

تقسیم کے بعد سے بھارت کے مسلمان جس دورِ مظلومیت سے گذر رہے ہیں، اس کا سب سے زیادہ تاریک پہلو کچھ عرصہ سے یہ نظر آ رہا تھا کہ جو لوگ وہاں مسلمانوں کی رہنمائی اور قیادت کے پوزیشن میں ہیں وہ خود بالکل حیرت اور سراسیمگی کی تاریکی میں گھرے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ جس کسی کی بھی کوئی چیز ہم نے پڑھی، یہی محسوس کیا کہ اس کے آگے بالکل اندھیرا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ خود کدھر جائے اور کدھر مسلمانوں کو چلنے کی دعوت دے۔ حد یہ ہے کہ جو لوگ خالص اسلامی قیادت اور اسلامی انقلاب برپا کرنے کے عزم و جزم کے ساتھ کام کر رہے تھے ان کو بھی حالات کی بے مہری نے "پس سپر بانداز کر دو" کے مقام حیرت و یاس پر لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔ یہ صورت حال ہمارے لئے نہایت پریشانی اور غم کا باعث تھی۔ قوموں کی زندگی میں سخت سے سخت دور بھی آ کے گذر جاتے ہیں اور قوم زندہ رہ جاتی ہے بشرطیکہ مشکلات کے اندھیرے لیڈروں کی سوجھ بوجھ اور ان کا عزم و حوصلہ شکست نہ کھا جائے لیکن جب جواب دے جائے کسی کے سامنے کوئی روشنی ہی باقی نہ رہ جائے تو پھر اس قوم کا زندہ باقی رہنا محال ہو جاتا ہے۔

ہم بھارت کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے مستقبل سے متعلق اسی تشویش اور روحانی اضطراب میں مبتلا تھے کہ ایک روز بھارت کی ڈاک سے یہ اخبار موصول ہوا۔ ہم نے امید و بیم کی ایک خاص کیفیت کے ساتھ اس اخبار کی سطر سطر پڑھی اور پڑھنے کے بعد محسوس کیا کہ ہمارے دل پر غم و الم کا جو بوجھ تھا اتر گیا ہے اور رگ رگ میں زندگی اور امید کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ اب تک اس اخبار کے چار شمارے نکل چکے ہیں اور ہر شمارہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس نے "الہلال" مرحوم کی یاد تازہ کر دی ہے۔ وہ کچھ زیادہ مبالغہ سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے متعلق سنا ہے کہ ان کو ہفتہ بھر الہلال کا انتظار رہتا تھا۔ جب آ جاتا تو اس کو مطالعہ کرنے کے بعد سامنے اپنے میز پر رکھ لیتے اور اس وقت تک اس کو میز سے اٹھانے کی اجازت نہ دیتے جب تک اس کے بعد کا نمبر ان کے میز پر اس کی جگہ لے لینے کے لئے

نہ آجاتا۔ کچھ یہی معاملہ ندائے ملت کے ساتھ ہوا ہے

اس اخبار کی سطر سطر سے ایمان کو غذا، روح کو تقویت، فکر کو رہنمائی اور عزم و حوصلہ کو ایک حیات تازہ ملتی ہے اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کے لئے بھارت کا مظلوم مسلمان اس وقت سخت محتاج تھا اس اخبار کے بانیوں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس بنیاد کو پالیا ہے جس پر بھارت کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تشکیل و تعمیر ہونی چاہیئے۔ اس وجہ سے اس کی دعوت ابتدا سے بالکل صحیح رُخ پر ہے۔ اس دعوت میں مسلمانوں کے دین، مسلمانوں کی تہذیب اور مسلمانوں کی عالمگیر برادری کے جو حقوق و مطالبات ہیں، ان کا بھی پوری جرأت اور پورے اعتماد کے ساتھ اظہار و اعلان کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ہندوستانی قومیت کے جو حقوق و واجبات بھارت کے مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں کھلے دل کے ساتھ ان کا بھی اعتراف کیا جا رہا ہے۔ البتہ جو چیزیں ہندو اکثریت کسی عقلی و شرعی دلیل کے بغیر ان واجبات کی فہرست میں شامل کرنے پر مصر ہے ان کا انکار کیا جا رہا ہے اور یہ انکار ایسی مومنانہ عزیمت اور صاف گوئی کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ پڑھ کر روح وجد میں آجاتی ہے۔

ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی ہے کہ یہ اخبار بڑی تیزی کے ساتھ مقبول ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مقبولیت میں اضافہ فرمائے اور اس کو نظر بد سے محفوظ رکھے، جن لوگوں نے ملت عزیز کو زندہ کرنے کے لئے یہ بازی کھیلی ہے ان کی درازی عمر کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں اپنی زندگی کے جو دن باقی ہیں، اگر وہ کچھ قدر و قیمت رکھتے ہیں تو رب کریم ان کو بھی مولانا علی میاں اور مولانا نعمانی کی عمروں کے ساتھ جوڑ دے کہ ان کے پاکیزہ ہاتھوں سے یہ ملت مظلوم کی نذر ہو جائیں۔

اس اخبار کا سالانہ چندہ ہندوستان کے لئے دس اور پاکستان کے لئے گیارہ روپے ہے۔ جو لوگ خریدنا چاہیں، وہ ہفت روزہ "ندائے ملت" لکھنؤ کے پتہ پر فرمائش کریں۔ اور ہم ہر دردمند مسلمان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس کو ضرور خریدے گا۔

تدبر قرآن
امین احسن اصلاحی

# تفسیر سورہ بقرہ

## (۲۵)

## ۷۹ - نسخ کی حقیقت اور اس کی ضرورت

اس مجموعۂ آیات کی تمام اہم تعلیمات کی طرف ہم آیات کی وضاحت کے ضمن میں اشارہ کرتے آئے ہیں، غور سے مطالعہ کرنے والوں کے لئے وہ کافی ہے، البتہ نسخ کا مسئلہ جو آیت ۱۰۶ میں بیان ہوا ہے وہ مزید وضاحت کا محتاج ہے، ہم اس کے بعض اہم پہلوؤں پر یہاں روشنی ڈالیں گے اور اس سلسلہ میں استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے فکر سے بھی استفادہ کریں گے۔

اوپر نسخ سے متعلق جو آیت گذری ہے، اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے۔ فرمایا ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (جو آیت (حکم) بھی ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کرا دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے مانند دوسری لاتے ہیں) سیاق و سباق اور نظم کلام کی روشنی میں ہم نے اس آیت کا تعلق صرف ادیان سابقہ سے مانا ہے۔ اہل کتاب نے یہ اعتراض جو اٹھایا تھا کہ قرآن جب ہماری کتابوں کو آسمانی تسلیم کرتا ہے تو اُن کی تعلیمات کو منسوخ کیوں کرتا ہے۔ قرآن نے یہ ان کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ اب آیئے اس جواب کی نوعیت پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ یہ ہر پہلو سے معقول اور اطمینان بخش ہے یا نہیں۔ آیت پر تدبر کرنے سے جواب کے دو پہلو واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ یہ نسخ خوب سے خوب تر کی طرف عروج اور ترقی کے نقطۂ نظر سے ہے۔ بالفاظ دیگر، اللہ تعالے کے اس وعدے کی تکمیل ہے جو اُس نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے فرمایا تھا کہ وہ اپنا آخری نبی بھیجے گا جو اللہ کی شریعت کو کامل کرے گا، تمام طیبات کو حلال کرے گا تمام خبائث کو حرام

ٹھہرائے گا اور لوگوں کو ان بہت سی پابندیوں سے آزاد کرے گا، جو اس وقت ان پر ہیں ۔

اس حقیقت کو واضح طور پر ذہن نشین کرنے کے لئے مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھئے

الف ۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت درجہ بدرجہ ترقی کرتی ہوئی اس نقطۂ کمال تک پہنچی ہے جس نقطۂ کمال پر وہ قرآن حکیم میں نظر آتی ہے۔ اس تدریجی ترقی کے لئے جو چیز مقتضی ہوئی ہے وہ انسان کی فطرت ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ تدریجی تربیت ہی کے ذریعہ سے اس مقام تک پہنچ سکتا تھا جس مقام پر پہنچ کر وہ خدا کے دین کامل کا اہل بن سکا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے سے پہلے تک اس کو جو دین ملا، وہ بنیادی طور پر تھا تو اسلام ہی لیکن اپنی ظاہری شکل وصورت یا بالفاظ دیگر اپنی شریعت کے اعتبار سے بہت کچھ انہی سانچوں پر ڈھلا ہوا تھا جو سانچے اس عہد کے ذہنی عقلی اور اجتماعی وتمدنی تقاضوں سے مناسبت رکھتے تھے۔ تدریجی تربیت کے ذریعہ سے جب اس کی فطرت کے تمام مضمرات واضح ہو گئے اور اس کی عقل بلوغ کو پہنچ گئی، محسوسات ورسوم کی قیدوں اور قومی وقبائلی تنگنائیوں سے آزاد ہو کر اس نے سوچنا سمجھنا شروع کیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے اس کو اسلام اس شکل وصورت اور اس شریعت کے لباس میں دیا جو ٹھیک ٹھیک اس کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ کوئی چیز نہ اس سے کم ہے نہ اس سے زیادہ ہے۔ یہ ترقی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ پچھلی شریعتوں کی بہت سی چیزیں بدلیں اور اسلام میں وہ اپنی ان شکلوں میں نمودار ہوں جو ان کی بالکل معیاری اور فطری شکلیں ہیں۔

ب ۔ تورات کے بہت سے احکام کی ظاہری شکل بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ یہ جس وقت نازل ہوئے تھے خام حالت میں تھے، ان کو پختہ ہونے کے لئے کسی اور فصل وموسم کا انتظار تھا۔ اسلام کے ظہور نے ان کے لئے وہ منتظر موسم فراہم کیا اور وہ پختگی کو پہنچے۔ مثلاً شراب ان کے ہاں صرف عبادت خانہ کے ذمہ داروں کے لئے حرام تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ یہ چیز تقویٰ وطہارت کے منافی ہے اور ایک دن آئے گا کہ یہ سب کے لئے حرام ہو کے رہے گی۔ چنانچہ اسلام نے اس کی حرمت کے سلسلہ میں پہلا قدم اس مقام سے اٹھایا کہ نماز کے اوقات میں اس کو حرام ٹھہرایا۔ پھر بتدریج اس کو بالکل حرام کر دیا روایات بلکہ قرآن کے اشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر جو لوگ زیادہ ذہین اور روح دین کے ذوق آشنا تھے۔ وہ پہلا ہی حکم سن کر ہوا کا رخ پہچان گئے اور اسی وقت سے وہ شراب سے بالکل تائب ہو گئے۔ اسی طرح کھانے پینے

کی دوسری چیزوں کی حلت وحرمت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض چیزیں یا تو بنی اسرائیل کے خاص قومی ذوق کے تحت ان کے لئے حرام ٹھرائی گئیں یا ان کے بیجا قسم کے سوالات کی سزا کے طور پر مثلاً اونٹ یا ذبیحہ کے بعض حصوں کی چربی یہ حرمتیں اپنی ہیئت ہی سے ظاہر کر رہی تھیں کہ یہ عارضی اور وقتی ہیں، ایک دن آئیگا کہ اس قسم کی تمام پابندیاں فطرت انسانی کے منافی ہونے کے سبب سے اٹھ جائینگی۔ چنانچہ دین فطرت نے الیوم احل لکم الطیبات (اب تمہارے لئے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں) کا عام اعلان کر کے اس قسم کی تمام پابندیوں کو منسوخ کر دیا۔ تورات سے اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن مقصود یہاں تفصیل نہیں بلکہ ایک حقیقت کی طرف صرف اشارہ ہے۔

ج۔ تکمیل و ترقی کی اس ضرورت کی طرف حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے نہایت غیر مبہم الفاظ میں اشارہ بھی فرمایا تھا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ

"خداوند تیرا خدا تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو اپنے خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں، میں ان کے لئے انہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ (استثناء ۱۸ = ۱۵-۲۰)

ان آیات میں جہاں ایک طرف نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا صریح الفاظ میں وعدہ ہے وہیں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ دین کی تکمیل آپ ہی کے ذریعہ سے ہوگی۔ حورب کے مقام میں بنی اسرائیل نے خود اس امر کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ اب مزید شریعت کا بوجھ اٹھانے کی طاقت اپنے اندر نہیں پا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراف ضعف کی تحسین فرمائی اور وعدہ فرمایا کہ وہ ان کے بھائیوں میں سے حضرت موسیٰؑ کی مانند ایک دوسرا نبی برپا کرے گا اور اس کے ذریعہ

۔ اپنے دین کی تکمیل فرمائے گا۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس حقیقت کو ظاہر فرمایا۔ ملاحظہ ہو۔

مگر اب میں اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ میں نے تم سے یہ باتیں کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ وہ آکر دُنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راستبازی کے بارے میں اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لئے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے۔ مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا رُوح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔

ان آیات میں "مددگار" اور "سچائی کا رُوح" یا بعض دوسرے ترجموں میں "معزی" اور "وکیل" کے الفاظ جو وارد ہوئے ہیں، ان کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ حضور ہی کے اوپر یہ بات منطبق ہو سکتی ہے کہ "وہ تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا" اور حضورؐ ہی کی یہ شان ہو سکتی ہے کہ "وہ اپنی طرف سے نہ کہیگا لیکن جو کچھ سنیگا وہی کہے گا"۔ بعینہ یہی بات قرآن مجید میں ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحیٰ (وہ یہ اپنے جی سے نہیں کہتا بلکہ یہ وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے) اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ پیشینگوئی فرمائی کہ نبی موعود ہی وہی کچھ کہے گا جو خداوند خدا اس کے منہ میں ڈالے گا اور جو خبر وہ دے گا اس میں وہ سچا ٹھہرے گا۔

تورات اور انجیل کی انہی پیشینگوئیوں کی طرف سورہ اعراف کی مندرجہ ذیل آیتوں میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

قَالَ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۚ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ ؗ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۠

(۱۵۵ - ۱۵۶)

فرمایا کہ رہا میرا عذاب تو میں اس کو نازل کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت تو ہر چیز پر محیط ہے۔ سو میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کے لئے جو مجھ سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔ یعنی جو پیروی کریں گے اس رسول اور نبی اُمی کی جس کو لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں، وہ ان کو حکم دیتا ہے نیکی کا اور روکتا ہے برائی سے اور ان کے لئے جائز کرتا ہے تمام پاکیزہ چیزوں کو اور حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزوں کو، اور ان سے دور کرتا ہے ان کے بوجھ اور ان پابندیوں کو جو ان پر پہلے سے تھیں، پس جو ایمان لائے اس پر اور جنہوں نے اس کی تائید اور مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اُتاری گئی، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(۲) جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ نسخ تجدید و احیائے دین کے تقاضے کے تحت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جو شریعت ملی تھی اس کے کچھ حصہ کو جیسا کہ قرآن مجید میں تصریح ہے، انہوں نے فراموش کر دیا تھا۔ اس فراموش کردہ حصہ میں سے جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے ضروری ٹھہرایا اس دین کامل کے ذریعہ سے اس کی تجدید فرما دی تاکہ دین کے خزانہ سے جو دولت یہود کی غفلت اور نالائقی سے ضائع ہو گئی تھی، وہ از سرِ نو محفوظ ہو جائے اور اگر اس کے کسی حصہ کو حکمتِ الٰہی نے ضروری نہیں ٹھہرایا، بلکہ اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ اس حصہ کو نظر انداز کر دیا جائے

تو اس کی جگہ اس کے ہم پایہ یا ہم مرتبہ دوسرے احکام عنایت فرمائے۔
یہاں انساء کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ فراموش کرا دینے کے معنی میں ہے۔ آیت زیر بحث میں اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، یہ نسبت اسی طرح کی ہے۔ جس طرح قرآن مجید میں دوسری جگہ فرمایا ہے فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم (جب وہ کج ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کج کر دیئے) اسلوب بیان اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ معاملہ اپنے قانون حکمت کے مطابق کیا اور اس لئے کیا کہ وہ اپنی شریعت کے معاملہ میں اپنی بے پرواہی کے سبب سے اسی چیز کے مستحق تھے۔ لیکن چونکہ شریعت الہٰی تمام انسانیت کا مشترک سرمایہ ہے اس وجہ سے جس طرح اسکے وقتی احکام کی اسلام کے دائمی اور اعلےٰ احکام کے ذریعہ سے تکمیل کی گئی، اسی طرح اسکے فراموش کردہ اور ضائع شدہ احکام کی ان کے مماثل احکام کے ذریعہ سے قرآن میں تجدید کی گئی۔

(۳) نسخ کی یہ ضرورت تکمیل دین اور تجدید شریعت کے پہلو سے بیان ہوئی اور یہ ایسی واضح ہے کہ یہود اور نصاریٰ کے لئے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی، لیکن قرآن مجید نے نسخ کے صرف انہی دو پہلوؤں کے بیان پر اکتفا نہیں فرمایا ہے، بلکہ ایک تیسرے پہلو سے بھی اس کی ضرورت بیان فرمائی ہے۔ یہ پہلو دین و شریعت کی تطہیر کا پہلو ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی شریعت کو ان بدعتوں اور ملاوٹوں سے پاک کرنا جو اہل بدعت اور خواہش پرستوں نے ان میں ملا دی ہوں۔ اس کا ذکر سورہ حج کی اس آیت میں ہوا ہے جس کا حوالہ ہم اوپر دے آئے ہیں۔ فرمایا ہے فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم یحکم اللہ آیاتہٖ (پس اللہ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان داخل کر دیتا ہے، پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کرتا ہے)

اس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ نسخ رد بدعات اور ابطال باطل کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اشرار و مفسدین نے آسمانی صحیفوں اور الہٰی شریعتوں میں جو بدعتیں اور من گھڑت چیزیں ملائیں، انبیاء علیہم السلام نے ان سے دین کو پاک و صاف کیا اور اس کی اصل تعلیمات کو از سر نو زندہ کرکے ان کو قائم کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے ان کی اکثریت انہی انبیاء پر مشتمل تھی جو کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے۔ بلکہ ان میں سے بیشتر کا مشن صرف یہی تھا کہ وہ پہلے سے نازل شدہ شریعت کو بدعتوں اور تحریفات سے پاک کرکے

اس کو اس کی اصلی حالت پر لوٹا دیں۔ اس اُمت میں یہ خدمت اللہ و رسول کی طرف سے علماء کے سپرد کی گئی ہے کہ وہ برابر دین کو بدعات و تحریفات سے پاک کرتے اور امت کو کتاب و سنت کی طرف لوٹاتے رہیں۔

پچھلی شریعتوں میں اس قسم کے جو اضافے کئے گئے اور اسلام نے جن کو منسوخ کر کے ان کی اصل حقیقت پیش کی یہاں ہم ان کی چند مثالیں ذکر کرتے ہیں تاکہ اس پہلو سے نسخ کی جو ضرورت و اہمیت ہے، وہ اچھی طرح واضح ہو کر سامنے آجائے۔

عقاید و ایمانیات کے باب میں یہود اور نصاریٰ نے جس قسم کی لغویات کا اضافہ کیا اور قرآن نے جن کی اصلاح کی ان میں سے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا تین کا تیسرا ہے یا مثلاً یہ کہ یہود اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں، یا یہ کہ اللہ تعالےٰ کو آسمان و زمین کے پیدا کرنے سے تکان ہوگئی اس وجہ سے اس نے ہفتہ کے دن آرام فرمایا۔ یا یہ کہ اللہ تعالےٰ نے ان سے اس بات کا اقرار لے رکھا ہے کہ جبتک کوئی نبی وہ قربانی پیش نہ کرے جس کو کھانے کے لئے آسمان سے آگ اُترے اس وقت تک وہ اس پر ایمان نہ لائیں یا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں برص کی بیماری تھی — قرآن مجید نے اس قسم کی تمام باتوں کی تردید کر کے اصل حقائق واضح فرمائے۔

اسی طرح یہود نے اپنی بدکارانہ زندگی کو جائز ٹھہرانے کے لئے اکثر انبیاء علیہم السلام سے متعلق نہایت بیہودہ قسم کی روایات اپنے صحیفوں میں شامل کردیں جو ان کے اخلاق کو بالکل مجروح کر دینے والی تھیں۔ قرآن مجید نے ان انبیاء کو اس قسم کے تمام اتہامات سے بری کر کے انکی زندگیوں کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کیا۔

اعمال کے باب میں ان لوگوں نے جس قسم کی بدعتیں کیں ان کی بعض مثالیں اس سورہ میں گذر چکی ہیں اور بعض کا ذکر آگے آرہا ہے۔ مثلاً ان کا وہ رویہ جو انہوں نے اپنی قوم کے قیدیوں کے بارہ میں اختیار کیا، یا جو روش انہوں نے سود کے معاملہ میں اختیار کی۔ نصاریٰ نے خنزیر اور گردن مروڑے ہوئے جانور کو جائز کر لیا۔

اسی طرح ان لوگوں نے تاریخ اور واقعات کو بھی بالکل مسخ کر کے اپنی خواہشات کے رنگ میں پیش کیا۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور خانہ کعبہ کی تاریخ کے اکثر حصہ پر پردہ ڈال دیا گیا تاکہ

حضرت ابراہیم ؑ کا تعلق بیت اللہ سے ثابت نہ ہو سکے اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشینگوئیوں کو مسخ کیا جا سکے۔ حضرت اسمٰعیل ؑ اور حضرت ہاجرہ سے متعلق بیانات میں بھی اسی مقصد کے تحت بہت سے تصرفات کیے گئے۔ قرآن مجید نے ان تمام تحریفات کا پردہ چاک کیا ور اصل حقائق بے نقاب کیے۔ استاذ امام ؒ نے رسالہ ذبیح میں ان چیزوں پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ آگے ہم بھی مناسب مواقع سے بعض مفید باتوں کی طرف اشارے کریں گے۔

## شریعت اسلامی میں نسخ کی نوعیت

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ سورہ بقرہ کی زیر بحث آیت کا تعلق تمام تر ادیان سابقہ سے ہے اور اس میں جس نسخ کا حوالہ ہے اس کی ضرورت اور اسکی حکمت اس قدر واضح ہے کہ کسی انصاف پسند کے لئے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلامی شریعت میں بھی نسخ ہے یا نہیں تو اس بارے میں ہمارے یہاں تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو نہ صرف نسخ کے قائل ہیں، بلکہ اس کو بہت زیادہ وسعت دیتے ہیں، دوسرا گروہ اس کا بالکلیہ منکر ہے۔ تیسرا گروہ اس کا قائل تو ہے لیکن اس کو صرف چند احکامات تک محدود مانتا ہے۔

ان میں سے پہلے وہ نے اس کے دائرے کو جو بہت زیادہ وسعت دی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک نسخ کا ایک خاص مفہوم ہے یہ لوگ ان تمام مواقع میں بھی نسخ مان لیتے ہیں، جہاں کوئی بات کسی عام کو خاص یا خاص کو عام کر رہی ہو یا کسی اجمال کو تفصیل کا رنگ دے رہی ہو، حالانکہ اس طرح کے مواقع میں نسخ ماننے سے زیادہ معقول بات یہ ہے کہ عام و خاص اور مجمل و مفصل کے درمیان توفیق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ توفیق نہایت آسانی کے ساتھ پیدا کی جا سکتی ہے۔

جو گروہ نسخ کا بالکلیہ منکر ہے اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے احکام حالات کے تابع ہیں، جو احکام منسوخ ہو گئے ہیں، وہ صرف اس وجہ سے منسوخ ہو گئے ہیں کہ جن حالات کے اندر وہ نازل ہوئے تھے۔ وہ حالات تبدیل ہو گئے۔ اب اگر وہی حالات دوبارہ پلٹ آئیں تو وہ احکام بھی از سر نو بحال ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے جو احکام بظاہر منسوخ ہیں۔ وہ فی الحقیقت منسوخ نہیں ہیں۔

بلکہ اپنے مخصوص حالات کے اندر بدستور قائم و زندہ ہیں، یہ گروہ اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں
بات بھی پیش کرتا ہے کہ اسلامی شریعت کا ارتقاء بالتدریج نرمی سے سختی کی طرف ہوا ہے
اس وجہ سے جب حالات اس بات کے مقتضی ہو جائیں کہ نرمی کی طرف پلٹا جائے تو یہ پلٹنا اسلا
شریعت کے مزاج کے عین مطابق ہوگا۔

ہمارے نزدیک اس رائے میں متعدد غلطیاں ہیں۔

اول تو بجائے خود یہ دعوے ہی بالکل بے بنیاد ہے کہ اول اول شریعت ہلکی تھی، بعد میں یہ سخت
ہوئی ہے۔ قرآن مجید پر غور کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض احکام میں اس کا ارتقا اگر نرمی
سختی کی طرف ہوا ہے۔ مثلاً تحریم شراب اور حکم صیام وغیرہ۔ تو بعض احکام میں سختی سے نرمی کی طر
بھی ہوا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ اللیل اور تعداد مقاتلین کے معاملہ میں۔ اس وجہ سے یہ فارمولا بنا کر کہ شریع
کا ارتقا نرمی سے سختی کی طرف ہوا ہے نسخ کے بارے میں کوئی نتیجہ نکال لینا مغالطہ سے محفوظ نہیں ہے

دوسری یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور ہمارے دور میں جو فرق ہے اس کو اس
ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلامی شریعت کی دنیا کو دعوت دی۔
اس وقت اسلام کی تعلیمات لوگوں کے لئے بالکل اوپری اور انوکھی تھیں، آپؐ کے صحابہؓ کی تعداد
تھوڑی تھی، لوگ جاہلی رسوم و عادات کے اتنے خوگر تھے کہ ان سے ان کے لئے نکلنا آسان ن
برعکس اس کے اس زمانہ میں حالات اس سے بہت مختلف ہیں۔ دنیا میں مسلمان کروڑوں کی تعدا
ہیں۔ اسلامی احکام و قوانین لوگوں کے لئے کوئی نامانوس اور اجنبی چیز نہیں ہیں، اس وجہ سے
زمانہ کو اس زمانہ پر قیاس کر کے ایک کے احکام کو دوسرے پر منطبق کرنا ہمارے خیال میں کسی طرح صحیح ن

تیسری یہ کہ اگر حالات کی تبدیلی کے بہانے شریعت کے منسوخات کی طرف پلٹنے کے جوا
تسلیم کر لیا جائے تو اس سے فتنہ پسند طبائع کے لئے شریعت سے فرار کی ایک ایسی راہ کھل
ہے جس کا بند کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس زمانے میں بڑی آسانی کے ساتھ اس دلیل کے سہا
روزہ، نماز، حرمت شراب اور حد زنا وغیرہ کے بارے میں سہولت پسند لوگ ایسے اجتہاد شروع
ہیں گے کہ دین کے معاملہ میں امان ہی اٹھ جائے گی۔ چنانچہ ماضی میں بھی گمراہ داعیوں کے ہا
اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ اور آج بھی اس کا تجربہ ہو رہا ہے۔ اسی چیز کی آڑ لے کر متجددین نے ا

ِدوں کے لئے شریعت کی حرام کی ہوئی بہت سی چیزوں کو جائز ٹھہرا دیا، اور پھر ان کے اندر
ے ان چیزوں کی حرمت کا احساس بھی رخصت ہو گیا۔

اس امر میں شبہ نہیں کہ بگڑے ہوئے ماحول میں بعض مرتبہ اچھے داعیانِ دین نے بھی نو واردوں
ر نومسلموں کیلئے شریعت کے بعض معاملات میں نرمی برتی ہے۔ لیکن اس نرمی کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی،
، وہ حالات کی تبدیلی کے تحت شریعت کے منسوخات کے اختیار کرنے کے قائل تھے، بلکہ یہ اُس
م کی ایک چشم پوشی اور مسامحت تھی جس قسم کی چشم پوشی بعض مرتبہ اربابِ اصلاح و تربیت اپنے کمزور
ر بگڑے ہوئے مریدوں اور شاگردوں کے کسی معاملہ میں اختیار کر لیتے ہیں۔ اس نوع کی مسامحت
بمانہ تربیت کا ایک جزو ہے۔ یہ اس توقع پر اختیار کی جاتی ہے کہ بالتدریج اس طرح کے خام
رگوں کی حالت صحبت اور تربیت سے اصلاح پذیر ہو جائیگی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر حالات میں یہ توقع
ری بھی ہوئی ہے۔ بشرطیکہ تربیت کرنے والے خود تقوےٰ کی صفات سے متصف رہے ہیں، محض
ندم نمائی اور جَو فروشی کی دُکان نہیں چلاتے رہے۔ اس چیز کو اس امر پر محمول کرنا ہمارے
زدیک صحیح نہیں ہے کہ یہ لوگ حالات کی تبدیلی کے تحت محکماتِ شریعت کو چھوڑ کر منسوخات
کے اختیارات کرنے کے قائل تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم نسخ کے باب میں مذکورہ بالا دونوں مسلکوں کو کمزور سمجھتے ہیں۔ اب رہ
گیا تیسرا مسلک یعنی ان لوگوں کا مسلک جو قرآن کی بعض آیات کو منسوخ مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک
یہی مسلک صحیح ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ آیات کون کون سی ہیں، وہ کن آیات سے منسوخ ہوئی
ہیں اور ان کے منسوخ ہونے کی علت کیا ہے تو ان سوالوں کے جواب دینے کا یہ موقع نہیں
ہے۔ اس کتاب میں اپنے اپنے موقع پر یہ بحثیں اللہ تعالےٰ نے چاہا تو آئینگی۔ یہاں صرف چند
اصولی باتیں ذہن نشین کر لیجئے۔

ایک تو یہ کہ قرآن کا کوئی حکم اگر منسوخ ہوا ہے تو قرآن ہی سے منسوخ ہوا ہے اور یہ ناسخ و
منسوخ دونوں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ قرآن کے کسی حکم کو قرآن کے سوا کوئی دوسری چیز منسوخ نہیں
کر سکتی۔ بعض فقہاء نے حدیث کو بھی قرآن کے لئے ناسخ مانا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ مسلک صحیح
نہیں ہے، اس مسلک کا ضعف اس قدر واضح ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ اس نسخ کا تعلق تمام تر صرف احکام و قوانین سے ہے، عقاید و ایمانیات یا اخلاق صفات یا واقعات و حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ عقاید و ایمانیات اور واقعات و حقائق ایسی چیزیں نہیں ہیں جو آج کچھ اور کل کچھ اور بن جائیں لیکن احکام و قوانین میں اگر کوئی ترمیم اصلاح خود قانون کا دینے والا کردے تو اس سے قانون کے مقصد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس سے اصل مقصد کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

تیسری یہ کہ اس نسخ کی ضرورت اس وجہ سے نہیں پیش آئی کہ نعوذ باللہ اللہ تعالےٰ کے علم میں کوئی نقص ہے جس کے سبب سے اس کے نازل کئے ہوئے قانون کو تجربات اور آزمائشوں کے مراحل سے گذرنا پڑا۔ بلکہ اس کی وجہ صرف بندوں کی بعض فطری خامیاں اور کمزوریاں ہیں، جن کے سبب سے وہ بسا اوقات کسی قانون کے قبول کرنے میں تدریج اور تربیت کے محتاج ہوتے ہیں اور اللہ تعالےٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے۔ اس وجہ سے اس نے یہ پسند فرمایا کہ وہ اپنے قانون میں اس تدریج و تربیت کو ملحوظ رکھے۔

یہ تدریج اور تربیت قرآن کے ناسخ اور منسوخ احکام پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے، کہ مختلف تقاضوں کے تحت مختلف طرز عمل کی مقتضی ہوئی ہے۔ مثلاً

بعض حالات میں یہ اس بات کی مقتضی ہوئی ہے کہ معاشرہ کے ابتدائی حالات کے تقاضوں کی مناسبت سے کسی باب خاص میں کوئی عارضی حکم دیا جائے اور جب معاشرہ اپنے بلوغ کو پہنچ جائے تو اس عارضی حکم کو آخری اور کامل حکم سے بدل دیا جائے۔ مثلاً ابتداءً ورثہ کے حقوق کے تحفظ کیلئے وصیت کا حکم دیا گیا، بدکاری کے سدباب کے لئے پنچائتی قسم کی تعزیر کی ہدایت کی گئی، انصار و مہاجرین کی اخوت کو اخلاقی اخوت سے بڑھا کر قانونی اخوت کا درجہ دیا گیا۔ لیکن بعد میں جب معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ کی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا تو وراثت کے آخری اور حتمی قانون اور زنا کی معین اور قطعی حد نے ان عارضی قوانین کو منسوخ کر کے خود ان کی جگہ لے لی۔

بعض حالات میں یہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ عام انسانی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی قانون درجہ بدرجہ اپنی آخری حد پر پہنچے، مثلاً شراب چونکہ اہل عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، اس وجہ سے ابتداءً یہ صرف نماز کے اوقات کے لئے حرام ہوئی، روزہ چونکہ عرب جیسے گرم ملک کے لئے

ری سخت چیز تھا اس وجہ سے شروع شروع میں اس کے ایام بھی کم رکھے گئے نیز سفر اور مرض کی
صورت میں فدیہ دے دینے کی بھی گنجائش رکھی گئی۔ لیکن بعد میں جب طبائع کو ان چیزوں سے انس ہو گیا
تو شراب کی قطعی حرمت کے حکم، ماہ رمضان کی تعداد کی تکمیل کی ہدایت اور فدیہ کی اجازت کی منسوخی
نے ان ابواب میں بھی شریعت کو کامل کر دیا۔ ان احکام کے بعد صرف اضطرار کے تحت ایک محدود
مشروط اجازت باقی رہ گئی۔

بعض صورتوں میں اس کا اقتضا یہ بھی ہوا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ شریعت کے
کسی حکم پر عمل کرنے کے لئے کچھ عرصہ تک آزاد چھوڑ دیا گیا۔ لیکن بعد میں اس اجازت کو منسوخ کر کے
اس کی جگہ اسلامی شریعت کا مستقل حکم دے دیا گیا۔ مثلاً قبلہ کے معاملہ میں۔ اس سے مقصود جیسا کہ قرآن
میں واضح کیا گیا ہے مسلمانوں کا امتحان لینا تھا کہ کون خدا اور رسول کی وفاداری میں پختہ ہے اور کون
اب تک اپنی پچھلی روایات ہی کا اندھا پرستار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امتحان تربیت ہی کا ایک جزو ہے۔

اسی طرح بعض حالات میں یہ اس بات کی مقتضی ہوئی کہ معاشرہ کی افرادی قوت کی کمی کی تلافی کے لئے
وقتی طور پر بعض ایسے احکام بھی دیئے جائیں جو کیفیت کو بڑھانے والے اور قلت تعداد کی حالت میں زیادہ بوجھ
اٹھانے کی صلاحیت پیدا کرنے والے ہوں۔ مثلاً ابتداءً عام مسلمانوں کو بھی تہجد کی پابندی کا حکم دیا گیا۔
میدان جہاد میں ایک کو دس کفار کا مدِ مقابل قرار دیا گیا۔ جماعتی استحکام و تطہیر کے تقاضوں کے تحت
نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی رازدارانہ بات کرنے سے پہلے صدقہ کی ہدایت کی گئی بعد میں جب مسلمانوں کی افرادی قوت بڑھ گئی نیز تطہیر
جماعت کا وقتی مقصد حاصل ہو گیا تو ان چیزوں میں تخفیف کر کے ان کو اسی عام سطح پر کر دیا گیا جو پہلے سے ان کیلئے شریعت میں مقرر تھی
یہ ہم نے صرف بعض اصولی باتوں کی طرف اشارات کئے ہیں۔ یہاں پیش نظر تمام ناسخ و منسوخ آیات کا استقصا اور انکے
مصالح کی وضاحت نہیں ہے۔ تفصیلی بحث منسوخ آیات کے تحت جیسا کہ عرض کیا گیا اپنے اپنے مقام میں آئیگی

اس تمام تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ خدا کی شریعت قرآن مجید میں اپنے ترقی و کمال کے
آخری درجہ پر پہنچ گئی ہے۔ اب اس کے بعد کسی نسخ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس شریعت میں تمام احکام کے
ساتھ مشکل اور مجبور کن حالات کے لئے رخصتیں اور رعائتیں بھی بیان کر دی گئی ہیں اس وجہ سے حالات
کی تبدیلی کے عذر پر منسوخ احکام کی طرف پلٹنے کے لئے بھی کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہی، البتہ اہل بدعت کی
پیدا کردہ ضلالتوں کے نسخ کا کام قیامت تک باقی رہے گا اور یہ کام اسلام میں علماء اور مصلحین کے سپرد رہے

افاداتِ فراہی

جناب خالد مسعود صاحب

# اصولِ تفسیر

## (۲)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ اگر امورِ عالم کی نسبتوں کو نہ سمجھا جائے تو آدمی ان کی حکمتوں سے اندھیرے میں رہتا ہے۔ یہ چیز بعض اوقات خدائے مدبر و دانا کے انکار کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جن لوگوں نے خارجی حوادث اور تاریخی واقعات پر غور نہ کیا، ان کی علتوں کو نہ سمجھا اور ذہنوں پر ان کے اثرات کا مشاہدہ نہ کیا تو وہ ان کے فائدوں اور حکمتوں کو نہ پا سکے۔ یا تو وہ خدا کا مطلق انکار کر بیٹھے یا جبر کا فلسفہ بنا کر اور دنیا کی بے مصلحتی کا یقین کر کے خدا کے انکار کے قریب جا پہنچے۔

اب جس طرح یہ ممکن ہے کہ آفاق و انفس پر تدبر کرنے والے اور نہ کرنے والے دو گروہ ہو سکتے ہیں اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ کلامِ الٰہی کے معاملہ میں بھی اس طرح کے دو گروہ بن جاتے۔ چنانچہ جن لوگوں نے آیات کے مفہوم کو سورہ کے اجزا کی مناسبت معلوم کئے بغیر سمجھنا چاہا ان پر کلام کی حکمت اور بلاغت و استدلال کے پہلو سے اس کا حسن نہ کھل سکا بلکہ جہاں کہیں ایک آیت کے زیادہ معانی کا احتمال ہوا وہاں یہ لوگ مشکل سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پا سکے۔ ایسے مقامات پر غلط تاویل اختیار کرنے کے نتیجہ میں بعض اوقات ایک غلط رائے یا مرجوح مذہب یا ایک فاسد عقیدہ پیدا ہو گیا۔ گویا تدبر نہ کرنے والا آدمی اوپر تلے کئی اندھیروں میں رہتا ہے۔ اس کا زیادہ سنگین بلکہ قبیح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دین فاسد تاویلات کے ذریعہ باطل پسندوں اور اہل بدعت کے لئے دروازے کھول دیتا ہے اور بعض اوقات محض رائے یا اس نفسانی خواہش کی بنا پر کہ لوگ اسے

دین کے حقائق اور اسرار کا محرم سمجھیں، یہ آدمی قرآن کی تاویل کر کے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔

اس کے برعکس جو شخص قرآن اور اس کے حکیمانہ نظام میں تدبر کرتا ہے۔ وہ اس کے نظم کی خوبصورتی، اس کی بلاغت کے اعجاز اور اس کی دقیق حکمتوں سے واقف ہوتا ہے۔ اس پر معانی کے دروازے کھلتے ہیں۔ جس مقام پر کئی تاویلات ممکن ہوں، وہاں وہ ایک ہی صحیح تاویل کی طرف رہنمائی پاتا ہے اِس طرح وہ واضح حق کو اختیار کر رہا ہوتا ہے اور باطل کے شکنجے میں نہیں آنے پاتا۔

## نظمِ قرآن کی دلالت

قرآن مجید اسلام و ایمان یعنی شرائع اور عقائد کی بنیاد ہے۔ فرمایا

كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (شوری ۵۳)

اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم کی رُوح وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے لیکن ہم نے اسے نور بنایا، جس کے ذریعہ ہم اسے ہدایت دیتے ہیں جسے اپنے بندوں میں سے دینا چاہیں اور تو بیشک سیدھے رستہ کی طرف بلاتا ہے۔

پس جب قرآن دین کیساتھ پوری پوری مطابقت رکھتا ہے تو اسکے نظام میں غور و فکر گویا شرائع و عقائد میں غور و فکر کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح قرآن نے چونکہ اصولوں اور بنیادوں سے آگاہ کر دیا ہے۔ جب تم اس میں تدبر کرو گے تو دراصل دین کی حکمت اور اس کے نظام امور کی طرف رہنمائی پاؤ گے۔

یہ بات مثال سے اس طرح سمجھو کہ قرآن نے اپنے نظم سے یہ بات واضح کی ہے کہ ایمان کی بنیاد شکر ہے۔ قرآن تمام شریعت کو اسی شکر کے تحت لاتا ہے۔ یہ اس لیئے ہے کہ جو شخص کائنات میں رحمت، حکمت اور قدرت کی نشانیاں دیکھے وہ ان سے ایک رحیم و حکیم، قادر و عزیز اور عادل پروردگار کو پہچانتا ہے، پھر وہ اس کا شکر کرتا ہے۔ اس کی حمد کرتا ہے۔ اس کی رضا کا طالب ہوتا ہے۔ اس کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے خوفزدہ ہوتا ہے۔ جب یہ احساسات پیدا ہو جاتے ہیں تو اس آدمی کا جذبۂ ایمان و عبودیت متحقق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا (نساء ۱۴۷)

اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا۔ اگر تم نے شکر کیا اور ایمان لائے اور اللہ قدردان اور علم رکھنے والا ہے۔

یہاں دیکھو رب رحیم پر ایمان سے پہلے جذبۂ شکر پر دلالت فرمائی۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا مقدمہ سورہ الحمد کو بنایا اور اسی سورہ کو نماز کی بنیاد اور شرائع و اسلام کا مقدمہ قرار دیا۔

مزید غور کرو تو شکر کے مظاہر و مواقع اگرچہ بیشمار معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے رکن دو ہیں ـــــ ایک تحدیث نعمت اور خدائے منعم کی تحمید، دوسرے خدا کے دیئے ہوئے مال میں سے نذر و قربانی ـــــ گویا نماز کا دوسرا رخ خدا کی مخلوق کے ساتھ احسان کا سلوک اور نیک مقاصد کے لئے انفاق ٹھیرا اور زکوٰۃ سے انکار کفر سے اتنا ہی قریب سمجھا گیا جتنا کہ ترکِ نماز ہے۔ یہ حقیقت صحابہؓ میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے سمجھی اور زکوٰۃ کا انکار کرنے والوں سے جہاد جائز سمجھا۔ ان کے استدلال کی ترتیب گویا یہ تھی کہ جو لوگ نماز نہیں پڑھتے، وہ از روئے شریعت ہم سے الگ ہیں اور ہمیں ان سے قتال کا حکم ہے۔ تو جو لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے ان کے لئے بھی یہی حکم ہونا چاہیئے۔ کیونکہ زکوٰۃ کا ذکر ہمیشہ نماز کے ساتھ ہوا ہے۔ جب کتاب اللہ میں اس کی جگہ نماز کے بعد ہے تو لازماً یہی جگہ اس کی دین کے اندر بھی ہونی چاہیئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ حقیقت نظم قرآن ہی کی رعایت سے سمجھی۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے اسی حقیقت کی تصریح فرمائی ہے۔ مرقس کی روایت میں لکھا ہے کہ انہوں نے توحید اور مخلوق کے ساتھ احسان کی وصیت کرنے کے بعد فرمایا "ان دونوں سے بڑھ کر کوئی دوسرا حکم نہیں"۔ متی کی روایت میں یوں آتا ہے۔

"خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دونوں کا حکم تاموس نے اور تمام انبیاء نے دیا ہے"۔

قرآن مجید نے اپنے نظم اور نص کے ذریعہ بالکل اسی حقیقت پر دلالت کی ہے۔
یہ جاننے کے بعد کہ رب رحیم پر ایمان کی بنیاد شکر پر ہے۔ اگر تم صبر کی حقیقت پر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ یہ آخرت پر ایمان کی اساس ہے اور یہ دونوں ایمان کے رکن ہیں۔ تیسرا رکن ایمان بالرسالت ہے۔ اس کا تعلق ایک پہلو سے خدا کے ہادی اور رازق ہونے کی صفتوں کے ساتھ ہے اور دوسرے پہلو سے خدا کی صفات عدالت و حکمت سے یہ متعلق ہے۔

گویا اب یہ متعین ہوا کہ شکر اور صبر تمام شرائع اور اچھی خصلتوں کو محیط ہیں۔ دین کا مدار بھی شکر اور صبر ہی پر ہے۔ دین کی تمام تعلیمات انہی دونوں بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہیں۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ، خضوع، والدین سے حسن سلوک اور ان کی اطاعت، قرابتداروں کی امداد اور مخلوقات سے احسان شکر سے متعلق ہیں اور روزہ، جہاد، عفت، بردباری، فضولیات سے اجتناب، توکل، خشیت اور تقوٰی صبر سے متعلق ہیں۔ گویا شکر اور صبر اپنے اپنے لشکروں کے سپہ سالار ہیں۔

اب غور کرو گے تو قرآن مجید کے واقعات تمہیں صبر با شکر ہی کی تعلیم دیں گے۔ مثلاً ایک موقعہ پر ارشاد ہے:-

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ (ابراہیم)

اس واقعہ میں نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لیے۔

ہمارا یہ تمام استنباط قرآن مجید کے نظم سے تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تم آیات کے نظم، اس کے مطالب اور سورتوں پر اور ان کے عمود پر غور کرتے ہو تو اس سے شریعت اور احکام کا نظام سمجھ میں آتا ہے۔

## علم نظام میں علماء کا حصّہ

یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ قرآن کے اندر نظم کی تلاش میں مَیں تنہا ہوں۔ مجھ سے پہلے علماء کی ایک جماعت نے اس راہ میں کوششیں کی ہیں۔ علامہ سیوطیؒ اتقان میں لکھتے ہیں پہلے شخص جنہوں نے علم مناسبت (علم نظم) کو [illegible] شیخ ابوبکر نیشاپوریؒ ہیں۔ خود ادب میں ان کا بڑا رتبہ تھا۔ ان کے لیے منبر رکھا جاتا جس پر بیٹھ کر وہ قرآن کی آیتیں

کی شرح کرتے اور بتاتے کہ فلاں آیت فلاں آیت کے پہلو میں کیوں رکھی گئی، اور فلاں سورہ کے فلاں سورہ کے ساتھ رکھنے میں کیا حکمت ہے اور علمائے بغداد کی تنقیص کہتے کہ یہ لوگ علم نظم سے بالکل محروم ہیں۔"

علامہ سیوطیؒ نے ابن عربی کا بھی مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے۔

"آیات قرآن کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھنا کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط کلام کے قالب میں ڈھل جائیں ایک عظیم الشان علم ہے۔ صرف ایک عالم نے اس علم سے تعرض کیا ہے۔ اسی اصول پر اس نے پوری سورہ بقرہ کو منظم کر دیا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ہم پر یہ دروازہ کھولا، لیکن ہم نے لوگوں کے اندر اس علم کے قدردان نہیں پائے۔ ساری دنیا دول ہمتوں اور کاہلوں سے بھری ہوئی ہے۔ پس ہم نے اس کو مہر بند ہی رکھا اور اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کے اس معاملہ کو اسی کی طرف لوٹا دیا۔"

متعدد علماء نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ علامہ سیوطیؒ اس بارہ میں لکھتے ہیں:

"ابوحیان کے شیخ علامہ ابوجعفر بن زبیر نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اس کا نام "البرہان فی مناسبۃ سور القرآن" ہے۔ ہمارے ہمعصروں میں شیخ برہان الدین بقاعی نے بھی اپنی کتاب "نظم الدرر فی تناسب الآی والسور" میں نظم کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔"

اس کے بعد علامہ سیوطیؒ نے خود اپنی کتاب کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں سورتوں اور آیتوں کی مناسبت کے علاوہ اعجاز قرآن کے مختلف پہلو بھی انہوں نے بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"نظم کا علم ایک نہایت اعلیٰ علم ہے اس کے اشکال کی وجہ سے علماء نے اس سے بہت کم بحث کی ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ تنہا شخص ہیں جنہوں نے اسکی طرف سب سے زیادہ توجہ کی ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ قرآنی حکمت کا بیشتر حصہ ترتیب و نظم کے اندر چھپا ہوا ہے۔"

خود مجھے امام رازیؒ کی تفسیر کبیر میں آیت ولو جعلناہ قرآنا عربیا (الخ
سجدہ) کے تحت نظم قرآن کے متعلق ان کا بیان ملا (جو اس سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے)
مخدوم مہائمیؒ کی تفسیر کا موضوع ہی نظم ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب کا نام تبصیر الرحمن
تیسیر المنان" رکھا ہے۔

## علم نظم کے پوشیدہ رہنے کے اسباب

علم نظام کے جاننے والے اگرچہ پہلے بھی رہے ہیں، لیکن
ن کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اب ہم وہ اسباب بتاتے
ں۔ جن کی بنا پر یہ علم پوشیدہ رہا ہے۔

قرآن مجید میں نظم کے وجود کا انکار جن لوگوں نے کیا ہے۔ انہوں نے اپنی خوشی
سے ایسا نہیں کیا، اگر وہ اس انکار پر مجبور نہ ہو گئے ہوتے تو اس سے یقیناً باز رہتے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی عقلمند آدمی لوگوں کے درمیان اپنا کلام پراگندہ حالت میں
چھوڑنے پر خوش نہیں ہوتا۔ اگر کلام کی پراگندگی ایک مدت کے بعد بھی مصنف پر ظاہر ہو
جائے تو وہ اس پر نظر ثانی کر کے اسے دور کر دیتا ہے۔ اسی طرح جس شخص سے آدمی حسن ظن
رکھتا ہو، اسے بے ربطی سے متہم نہیں کرتا۔ البتہ اگر وہ اس کے سمجھنے سے عاجز آ جائے،
تو پھر اپنی ذات کے قصور کو تسلیم کرنے کی بجائے اسے کہنے والے کی خامی پر محمول کرتا ہے۔
یہ معاملہ تو اس وقت پیش آتا ہے جب کلام مخلوق کا ہوتا ہے۔ لیکن اگر کلام پاک، بلند مرتبہ
خالق کا ہو، وہ ترتیب نزول پر مرتب بھی نہ ہوا ہو، اس کا القا ایک امانتدار فرشتے نے ایک
ایسے فصیح اللسان نبی پر کیا ہو جو فصاحت اور بیان میں شہرت رکھنے والی قوم میں سے
ہو، یہ نبی کو کئی مرتبہ پڑھ کر سنایا بھی گیا ہو اور پھر اس بات میں بھی شک کرنے کی گنجائش
نہ ہو کہ ہر چیز کا حسن اور اس کی نفع بخشی اس کے متناسب اجزا ہی میں مضمر ہوتی ہے — تو
...... پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ اور اس کی کتاب پر ایمان لانے والا ایک مسلمان کس طرح
یہ گمان کر سکتا ہے کہ یہ کتاب نظم سے عاری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے قرآن میں
نظم کا انکار کیا ہے انہوں نے ...... اسباب کی بنا پر ایسا کیا ہے ...... مسائل پر ...... ہو

گئے تھے اب ہم ان میں سے چند اہم اسباب کا ذکر کریں گے۔

**پہلا** اور سب سے قوی سبب کلام اللہ کو ہر عیب اور نقص کے الزام سے بری ثابت کرنے کی کوشش ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیشتر مقامات پر قرآن کا نظم بالکل ظاہر ہے لیکن اگر لوگوں کا دعوٰے یہ ہوتا کہ پورا قرآن منظم ہے اور اس کے نظم کی رعایت لازمی ہے تو وہ ایسے مقامات پر بہت مجبور ہو جاتے جہاں نظم کی تلاش اس کے دقیق ہونے کی وجہ سے مشکل ہے۔ لہذا انہوں نے اس مسلک ہی کو اختیار نہ کیا۔ نظم سے لاعلمی کو انہوں نے اپنے فہم کے قصور پر محمول اس لئے نہ کیا کہ بظاہر بعض چیزیں اصول نظم کے خلاف انہیں نظر آئیں۔ مثلاً آیت حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (البقرہ) تمام نمازوں کی حفاظت کرو اور خصوصاً درمیانی نماز کی۔

یہ آیت جس موقع پر آئی ہے اس سے پہلے عورتوں کا ذکر ہے۔ اس آیت کے بعد دوبارہ کلام اسی پہلے ذکر کی طرف لوٹ جاتا ہے، اگر درمیان میں یہ آیت نہ ہوتی تو پورا بیان متصل ہوتا جن لوگوں نے اس آیت کی مناسبت واضح کی ہے انہوں نے کوئی ایسی چیز نہیں پیش کی جسے ایک انصاف پسند آدمی قبول کرے اور اس کی پیروی کرے۔ جو لوگ وجود نظم پر یقین رکھتے ہیں، ان میں سے بعض نے اس آیت کے نظم کے متعلق اپنے فہم کی درماندگی کا اعتراف کر لیا اور یہی محفوظ طریقہ بھی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے برسوں کے فکر و تدبر کے بعد اس مشکل سے ہمارے لئے پردہ اٹھا دیا۔ اس پر اللہ رب العالمین کا شکر ہے۔ اگر وہ ہدایت نہ دیتا تو ہم کبھی رستہ نہ پا سکتے۔

**دوسرا** سبب (جو کہ پہلے کی نسبت کم اہم نہیں ہے، لیکن اس کا تعلق مصنفین کے بجائے عام قارئین سے ہے) یہ ہے کہ جن لوگوں نے نظم کی طرف توجہ کی (مثلاً امام رازیؒ) انہوں نے اس مشکل کام میں بہت ہی سرسری اور سطحی چیزوں پر قناعت کر لی۔ امام رازیؒ اگرچہ نظری علوم اور فہم و ذکاوت میں بہت آگے ہیں لیکن ہر دیکھنے والا ان کا کلام دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ جس نظم کا یہ متبحر امام دعوٰے کرتے ہیں وہ باوجود غور و فکر کے ان سے مخفی رہا ہے۔ جب وہ اس کی خاطر کمزور سے کمزور بات بھی کہہ ڈالتے ہیں تو پڑھنے والے کے اندر اس علم کا شوق باقی نہیں رہتا۔ جس شخص پر یہ اثر پڑتا ہے وہ یا تو نظم کا اقرار کرنے

جود اس علم سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اور اپنے اوپر اس کا دروازہ بند کر لیتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی
ص نظم کی دعوت بھی دے تو یہ اس کی بات پر کان نہیں دھرتا یا وہ یہ رائے
تیار کر لیتا ہے کہ . . . . . . . . . . . . قرآن چونکہ
ف الگ وقتوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہوا ہے۔ اس لئے اس میں نظم کی تلاش
مل ہے۔

تیسرا سبب جو نظم قرآن کے اخفاء کا باعث ہوا ہے۔ تاویل کے متعدد پہلوؤں
ثوں اور روایتوں کا موجود ہونا ہے۔ نظم، کلام کو ایک وحدت کی طرف لے جانے والی چیز
ہے۔ تاویلیں جتنی مختلف ہوں گی نظم کی تلاش اسی قدر مشکل ہو گی۔ ان اقوال و روایات
دیکھ کر آدمی اس کشمکش و پیچ میں پڑ جائے گا کہ ان میں سے کون سی رائے اختیار کرے۔
ں کی حالت اس شخص کی ہوتی ہے جو ایک چوراہے پر کھڑا ہو اور اسے یہ نہ معلوم ہو کہ
سے کس رستہ پر جانا ہے۔ اس صورت حال اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر
م یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ صرف اسی تاویل پر قناعت کی جائے۔ جس سے کلام منظم
ہو جائے اس طریقہ کو ہم نے تاویل کے اعتبار سے زیادہ اچھا اور اصول بلاغت کے مطابق
پایا ہے سلف کا طریقہ یہ تھا کہ ان میں سے ہر ایک نے صرف ایک تاویل اختیار کی . . .
. . . . . لیکن بعد کے لوگوں نے اختلاف اقوال کو پھیلا دیا۔ یہ معاملہ ہر علم کے
ساتھ ہوتا ہے۔ جب کتابیں زیادہ ہو جاتی ہیں علم مدون ہو جاتا ہے اور اس کا سیکھنا آسان
ہو جاتا ہے تو لوگ تبحر اور کمال کی حرص میں . . . . . . . . کثرت اقوال و مذاہب
ہی کو علم سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ طلب الکل فوت الکل کے مقولہ کے مطابق انہیں اس طرح
لم حاصل نہیں ہوتا۔ علم تفسیر کے معاملہ میں بھی ایسا ہی ہے جو شخص اس علم میں مشغول ہو وہ اسے اقوال
کا ایک سمندر پائے گا۔ اگر آدمی ان اقوال کی محافظت کرنے لگے تو نظم کے طریقہ پر چلنا
ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے لئے واحد طریقہ یہی ہے کہ سلف کے طریقہ پر خود قرآن
پر غور کیا جائے اور سنت ثابتہ سے اس کی مطابقت تلاش کی جائے۔ اس کے نتیجہ میں نظم
سمجھ میں آئے گا اور تاویل صحیح ہو گی

چوتھا سبب جو تیسرے سبب سے قریب ہی ہے، یہ ہوا کہ اُمت فرقوں اور گروہوں میں
گئی تو ہر ایک فرقے نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق کلام الٰہی سے دلیل لینی چاہی۔ وہ
ہے ظاہر کلام سے اپنے مطلب کی تاویل کر لیتے یا کلام کے محتملات سے مطلوبہ نتیجہ
نکال لیتے، ان کے لئے برابر تھا۔ یہ بات تو پوشیدہ نہیں کہ رائے یا وہم کا غلبہ ایک بعید
یز کو قریب اور کمزور کو قوی بنا دیتا ہے۔ جب ہر فریق نے اپنے اپنے مقصد کے مطابق تاویل
لی تو نظم کی رعایت ممکن نہ رہی، کیونکہ کلام تو بہر حال سیاق اور اجزا کے موقع کے مطابق
ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ لوگ نظم کی رعایت بھی کرتے تو ان کے نقطہ نظر کا ضعف واضح ہو جاتا،
ور انہیں ان کے مسلک کے خلاف لے جاتا۔ جیسے ایک کلمہ جب تک الگ رہے تو اس
کے کئی معانی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ لیکن جب اسے ایک کلام میں جگہ دی گئی ہو۔ تو
اس کے معانی کے احتمالات کی کثرت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے وہ معنی متعین ہو جاتے
ہیں جو جملہ کے مجموعی مضمون سے مطابقت رکھتے ہوں۔

مقالات

مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب

# اسلام اور انسانی حقوق

انسانی عظمت و فضیلت کا تصور جو اسلام نے پیش کیا ہے، دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اس قدر نمایاں ہے کہ اسلام میں انسان کی برتری تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ اسے یہاں جو حقوق و اختیارات دیئے گئے ہیں وہ بھی واضح طور پر دوسرے مذاہب کی نسبت زیادہ ہیں۔ دوسری مخلوقات پر اسے جو فضیلت اور برتری حاصل ہے، اس کے بارے میں قرآن مجید کا ایک بیان ملاحظہ ہو۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل ۷۰)

اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور بحر و بر میں انہیں سواری دی اور پاکیزہ چیزیں عطا کیں اور اپنی بیشتر مخلوقات پر انہیں فضیلت دی۔

انسان کی یہی فضیلت تھی جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں اپنا نائب اور خلیفہ متعین کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ فرشتوں نے جب یہ سوال کیا کہ شب و روز عبادت و اطاعت میں ہم کوئی کوتاہی نہیں کرتے، پھر انسان کو خلافت و نیابت کا مستحق کیوں سمجھا گیا ہے جبکہ اسکے اختیارات کا نتیجہ فساد و خونریزی کی شکل میں نکل سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی عظمت و کرامت ہی کا مظاہرہ کیا جس سے فرشتے مطمئن ہو گئے۔ انسان کی یہی عظمت و فضیلت تھی جس کی بنا پر اسے امانت الٰہی کا وہ بار گراں سپرد کیا گیا، جس کے تحمل سے کائنات کی ساری چیزوں نے انکار کر دیا تھا۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (احزاب ۷۲)

ہم نے آسمانوں، پہاڑوں اور زمین کے سامنے امانت پیش کی تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے، لیکن انسان نے اسے اٹھا لیا۔

دوسری مخلوقات پر انسان کی فوقیت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں اسکے فائدہ اور آرام کے لئے پیدا کی گئی ہیں تخلیق عالم کا باعث و مقصود وہی ہے اور تمام کارخانہ حیات اس کے استعمال کے لئے بنایا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرہ ۲۹)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

یعنی زمین کے اندر جو کچھ ہے سب خدا کی طرف سے انسان کے استفادہ کیلئے ہے اور کائنات کی تمام چیزیں اس کے لئے مسخر کر دی ہیں فرمایا۔

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (لقمان ۲۰)

کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تمہارے فائدہ کیلئے وہ سب کچھ مسخر کر دیا جو آسمانوں اور زمین کے اندر ہے اور تم پر اپنی کھلی اور چھپی ہر قسم کی نعمتیں پوری کر دیں۔

زمین و آسمان، رات، دن، چاند، سورج، آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے، شجر و حجر، دریا اور پہاڑ، بارش اور ہوائیں، سرسبز و شاداب کھیتیاں اور تر و تازہ میوے اور پھل، حیوانات اور دیگر تمام اشیاء جو حد و شمار سے بھی باہر ہیں خدا کی عظیم نعمت ہیں اور انسان کے تمتع کے لئے ہیں۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان سے بارش اتاری تاکہ اس سے تمہارے رزق کے لئے پھل اگائے اور کشتیاں تمہارے لئے مسخر کیں تاکہ وہ دریا میں اس کے حکم سے چلیں اور . . . . . . . اور تمہارے

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ۝

(ابراہیم ۳۲ تا ۳۴)

لیئے دریا مسخر کیئے اور سورج و چاند کو ایک دستور پر اور رات و دن کو تمہارے لیئے مسخر کیا اور جو چیزیں تم نے اس سے مانگیں (جن کی تمہیں ضرورت ہوئی) اس نے وہ سب عطا کیں اور اگر تم اس کے انعامات کا استعمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ بلاشبہ انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

اس قسم کی آیات قرآن مجید میں بے شمار ہیں، ان کی تفصیل میں جانیکی ضرورت نہیں اب صرف قابل غور بات یہ رہ جاتی ہے کہ جس دین میں انسان کو اتنی کرامت و عزت بخشی ہو گئی ہو اور کہا گیا ہو کہ سارا کارخانۂ عالم انسان کے استعمال فائدہ کے لئے بنایا گیا ہے کیا اس میں انسانوں کے جائز حقوق و مطالبات اور اختیارات و مراعات کا جیسا کہ اس پر الزام لگایا جاتا ہے، خیال نہ رکھا گیا ہوگا؟ اور کیا اس دین نے انسان کی جان و مال، عزت و آبرو اور آزادی رائے وغیرہ حقوق کا احترام نہ کیا ہوگا؟ اس تمہید کے بعد اب ہم ان حقوق و مراعات پر غور کریں گے جو اسلام نے انسان کو دی ہیں۔

## جان کی حفاظت

دنیا میں انسان کا سب سے پہلا اہم اور بنیادی حق یہ ہے کہ وہ زندہ رہے اور اسکی جان ہر اعتبار سے محفوظ ہو اسے کسی قسم کا خطرہ اور ضرر لاحق نہ ہو اسکی زندگی ہر اعتبار سے مطمئن اور پُر سکون ہو اور وہ خود ہر طرح خوشحال اور فارغ البال ہو۔

اس اہم اور بنیادی حق کا اسلام نے اتنا خیال رکھا ہے کہ اس کا عشر عشیر بھی ان مذاہب میں نہیں پایا جاتا جو رحم و مروت کے پیکر اور اہنسا اور عدم تشدد کے علمبردار خیال کئے جاتے ہیں۔ حدود و تعزیرات کے اکثر احکام و قوانین مدنی زندگی میں نازل ہوئے لیکن انسان کی زندگی کی حفاظت اور جان کی حرمت کا حکم مکہ ہی میں نازل ہوگیا تھا سورۂ بنی اسرائیل میں جو قوانین و احکام دیئے گئے تھے ان میں سے ایک اہم حکم یہ بھی تھا۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ

خدا نے جس جان کو حرام کیا ہے اسے [illegible]

إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا (بنی اسرائیل ۳۳)

نہ مارو اور جو ناحق مارا جائے تو اس کے وارث کو ہم نے اختیار دیا ہے اور چاہیئے کہ وہ قصاص میں زیادتی نہ کرے اس کی مدد کی جائے گی۔

خدا نے اپنے محبوب نیک بندوں کے جو اوصاف گنائے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (فرقان ۶۸)

(خدائے رحمٰن کے بندے) اس کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور ناحق اس جان کو نہیں مارتے جسے اس نے حرام کیا ہے۔

یہ اجمالی حکم تھا اسکی پوری تفصیل مدنی زندگی میں بیان کی گئی جہاں مقتول کا قصاص لینے کا حکم دیا گیا اور اس میں کسی آزاد یا غلام، مرد یا عورت کی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى (بقرہ ۱۷۸)

ایمان والو تم پر مقتولین کا قصاص (لینا) فرض کیا گیا ہے۔

قصاص کے اس حکم سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ اس طرح مزید لوگوں کی زندگیاں تلف ہوں گی اور یہ حکم خونریزی کا باعث بنے گا۔ اس غلط فہمی کو بڑی قوت سے دور کیا گیا اور بتایا گیا کہ قصاص میں مرنے والوں کی موت سے بحیثیت مجموعی قوم کی زندگی محفوظ ہو گی۔ قصاص کا مقصد قتل و خونریزی کا بالکل سدباب اور نوع انسانی کی بقا و تحفظ کی عام ضمانت ہے۔ فرمایا

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (بقرہ ۱۷۹)

اے عقلمندو تمہارے لئے قصاص کے اندر زندگی ہے تاکہ تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔

جو لوگ زمین میں فساد برپا کر کے امن عامہ میں خلل ڈالنا اور انسانی زندگی کے سکون و راحت کو درہم برہم کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے قرآن نے بڑی عبرتناک اور سخت سزا تجویز کی۔ فرمایا

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَن

ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے کہ بُری طرح قتل کئے

يُقَتَّلُوٓا اَوْ يُصَلَّبُوٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (مائدہ ۳۶)

جائیں یا پھانسی دیئے جائیں یا ان کے اِدھر کے ہاتھ اور اُدھر کے پیر کاٹ ڈالے جائیں یا جلا وطن کر دیئے جائیں۔

عربوں میں اس کا بھی رواج تھا کہ وہ اپنی اولاد کو فقر و فاقہ اور دوسری اُلجھنوں سے بچنے کیلئے قتل کر دیا کرتے تھے۔ قرآن نے اس مشرکانہ اور بہیمانہ خصلت کا کئی مقام پر ذکر کیا ہے اس شنیع اور ناگوار معاملہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا حکم فرمایا۔

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (بنی اسرائیل ۳۱)

تنگی اور فاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو ہم انہیں روزی دیں گے اور تمہیں بھی ہم ہی روزی دیتے ہیں انہیں مارنا بہت بڑا گناہ ہے۔

اسلام کو انسان کی جان اس قدر عزیز ہے کہ اس نے ہر شخص کو نہ صرف یہ کہ دوسروں کی جان پر حملہ آور ہونے سے منع کیا ہے، بلکہ خود اسے بھی اس بات کی تاکید کی ہے کہ وہ اپنی جان کی حفاظت کرے۔ غیر معمولی عبادت و ریاضت کرکے انسان اپنے آپ کو اگر مشقت و تکلیف دیتا ہے تو یہ بھی اسلام کو پسند نہیں اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ بیشک تمہارے اوپر تمہارے جسم، تمہاری آنکھ اور تمہارے دوسرے اعضاء نیز متعلقین کے بھی حقوق ہیں۔ جو لوگ دنیا کی پریشانیوں سے گھبرا کر خودکشی کر بیٹھتے ہیں انہیں جہنم کی وعید سنائی گئی۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے۔

مَنْ تَرَدّٰى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ يَتَرَدّٰى فِيْهَا خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا وَمَنْ تَحَسّٰى سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَسُمُّهٗ فِىْ يَدِهٖ يَتَحَسَّاهُ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهٗ بِحَدِيْدَةٍ فَحَدِيْدَتُهٗ فِىْ يَدِهٖ يَجَأُ بِهَا فِىْ بَطْنِهٖ نَارِ

جو شخص پہاڑ سے گر کر اپنے کو ہلاک کر دے تو وہ جہنم میں داخل ہوگا اور وہاں ہمیشہ ہمیشہ گرتا رہیگا اور جو شخص زہر کھا کر ہلاک ہوا اس کا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا اور جہنم میں اسے ہمیشہ ہمیشہ نگلتا رہے گا اور جس شخص نے چھری اور لوہے سے اپنے کو ہلاک کیا تو اسکو جہنم میں لایا جائیگا پھر اس کے ہاتھ ہوگا جسے وہ پیٹ میں

جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِيْهَا اَبَدًا — گھونپتا ہوگا اور وہ اس حالت میں ہمیشہ رہیگا۔

صرف اسی قدر نہیں بلکہ اسلام نے تو اس سے بھی منع کیا ہے کہ کوئی شخص مجرد خودکشی کے بارہ میں سوچے یا اپنے دل میں اس کا خیال لائے یا موت کی آرزو یا تمنا کرے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے۔

لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ اِمَّا مُحْسِنًا فَلَعَلَّهٗ يَزْدَادُ وَاِمَّا مُسِيئًا فَلَعَلَّهٗ يَسْتَعْتِبُ — کوئی شخص موت کی آرزو نہ کرے اگر وہ اچھے کام کر رہا ہے تو ممکن ہے آئندہ اسکی اور اضافہ ہو اور اگر بدکار ہے تو شاید (آئندہ اسے) توبہ کا موقع ملے

اسلام نے جس طرح جان مارنے اور قتل کرنے کو بہت بڑی معصیت قرار دیا ہے اسی طرح خدا کے بندوں کے ساتھ کسی قسم کا ظلم و تعدی کرنے سے بھی منع کیا ہے، لوگوں کے جسم و روح کو کسی طرح کا صدمہ پہنچانا یا انہیں کسی بہانے بھی ستانے اور دُکھ دینے سے نہایت شدت کے ساتھ روکا ہے۔ اس کے نزدیک بقول خواجہ حافظؒ مردم آزاری سے کوئی بڑا گناہ نہیں ہے

مباش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کُن — کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

اس لئے اسلام نے تمام لوگوں پر دُوسرے لوگوں کے حقوق عائد کئے ہیں۔ ماں باپ کے حقوق کیا ہیں، ازواج و اولاد کے معاملہ میں کیا طرزِ عمل ہو، اعزہ و اقربا کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے، مہمانوں اور پڑوسیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ چھوٹے بڑے اور ہمعصر لوگوں میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اور دوست تو دوست دشمنوں کے ساتھ بھی کیا معاملہ کرنا چاہیئے۔ ان سب کا جواب صرف ایک یعنے حسن سلوک اور خوش معاملگی ہے کہیں بھی اس کی اجازت نہیں دیگئی ہے کہ آدمی کسی آدمی کے ساتھ ظلم نا انصافی، حق تلفی اور اذیت کا برتاؤ کرے اس کے متعلق قرآن مجید اور حدیثوں میں اس قدر ہدایات دی گئی ہیں کہ ان کو نقل کرنا موجب طوالت ہوگا اور یہ تو محض جان کی حفاظت کا سوال تھا۔ اسلام دوسری طرف اس بات کی بھی کوشش کرتا ہے کہ ہر شخص دُنیا میں ترقی کرے اور خوشحالی کی زندگی بسر کرے۔ وہ ان اسباب و ذرائع کو مہیا کرتا ہے۔ جن سے آدمی دُنیا میں فائدہ اُٹھا کر اپنے آپ کو آرام و راحت پہنچائے۔ اور اپنی ترقی و فلاح و کامرانی کی راہ اختیار کرے۔

یہ تو انسان کی جان جسم اور رُوح کا معاملہ تھا، اسلام نے تو عام مخلوقات، جانوروں، پرندوں

ور حشرات الارض وغیرہ کے معاملہ میں بھی الٰہی تعلیم دی ہے جو ان کی حفاظت اور نگہداشت کی
پورے طور سے ضامن ہے۔

**مال کا تحفظ** انسان کی جان کے بعد اس کے مال کا درجہ ہے اسلام جس طرح انسان کی جان کو معزز و محترم سمجھتا ہے اسی طرح مال کو بھی محترم سمجھتا ہے۔ وہ کسی شخص کو بھی اسکی اجازت نہیں دیتا کہ وہ دوسرے کی جان کی طرح اس کے مال پر حملہ آور ہو یا زبردستی سے اور ناجائز طریقے سے کسی کے مال پر قبضہ کرے اس لئے اسلام نے تمام ایسے طریقوں کا سدّباب کیا ہے جن سے لوگ دوسروں کا مال ہضم کرتے ہیں۔ قرآن نے چوری کرنے والوں کی یہ سزا مقرر کی ہے

اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا (مائدہ ۴۱) — چوری کرنے والے مرد اور عورت کا ہاتھ کاٹ دو۔

فتح مکہ کے موقع پر قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے اس جرم کا ارتکاب کیا۔ وہ ایک معزز اور شریف گھرانے کی عورت تھی اس لئے لوگوں کو اس کے ہاتھ کاٹے جانے کے متعلق تشویش ہوئی انہوں نے حضرت اسامہ بن زیدؓ سے جو آنحضرت صلعم کے نہایت چہیتے تھے اس کے متعلق سفارش کرائی۔ آپ سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ تم سے پہلے کے لوگوں کی ہلاکت کا یہی سبب ہوا کہ وہ نچلے طبقہ کے لوگوں پر تو احکام و حدود جاری کرتے لیکن اوپر کے درجہ کے لوگ جب جرائم کا ارتکاب کرتے تو ان سے درگذر کرتے۔ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ لیتا۔

چوری کے علاوہ ناجائز طور سے مال لے لینے کے مختلف طریقے ہیں مثلاً خیانت، بددیانتی، ڈاکہ، غصب، بے ایمانی، دھوکہ، فریب، رشوت، ناپ تول میں کمی بیشی اور سود وغیرہ ان سب کو اسلام نے نہایت قبیح اور مذموم فعل قرار دیا ہے قرآن نے ایک مختصر سی آیت میں حرام خوری کی تمام شکلوں کی مذمت کر دی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ (نساء ۲۸) — اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور سے مت کھاؤ۔ الا یہ کہ وہ باہمی رضامندی سے لین دین کا معاملہ ہو۔

یتیم بچوں سے زیادہ مظلوم اور قابل رحم طبقہ کون ہوگا لیکن ان سے زیادہ ظلم و ستم کا نشانہ بھی

کوئی نہیں بتایا جاتا، ان کے مال کو ہڑپ کرنے کے لئے اچھے اچھے پارسا بھی کیسے کیسے جتن کرتے اور اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں لیکن قرآن نے آکر یہ وعید سنائی:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا (نساء ۹)

جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور سے کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ ڈالتے ہیں اور وہ عنقریب جہنم کی آگ میں جائیں گے۔

سودی کاروبار سے بڑھ کر کونسا ڈاکہ ہو سکتا ہے اور در اصل اس کے ذریعہ سرمایہ دار غریبوں کا لہو پیتے ہیں لیکن قرآن پونے چودہ سو برس پہلے اس جاہلانہ اور بہیمانہ رسم کو ختم کر چکا تھا۔ مگر افسوس کہ آج کل کی ترقی یافتہ دنیا میں یہ وبا اس قدر عام ہے کہ اچھے اچھے پاکباز اور پاکدامن بھی اس لعنت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے ہیں — ایک جگہ اہل ایمان کو سود خوری پر کتنی سخت تنبیہہ کی گئی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آل عمران ۱۳۰)

اے ایمان والو دگنا چوگنا کر کے سود نہ کھاؤ۔

سود کی ہی کی بنا پر اسے ایک ایسا جرم قرار دیا گیا جو خدا و رسول سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ

(بقرہ ۲۷۸)

ایمان والو اللہ سے ڈرو اور جو سود رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو اگر تم واقعی مومن ہو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو (تمہارا رویہ خدا اور رسول سے لڑائی لڑنے کا ہے سو) اعلان کردو خدا اور رسول سے جنگ کا اور اس اعلان جنگ کے نتیجہ کے لئے تیار رہو) اور اگر تم (سود سے) باز آجاؤ تو تمہارے لئے اصل سرمایہ ہے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔

احادیث میں سود خوری کی تمام جزئیات کی تشریح کرکے ان کی ممانعت کی گئی ہے۔

اسی طرح رشوت سے بھی منع کیا گیا ہے فرمایا۔

وَلَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (بقرہ ۱۸۸)

آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ جانتے بوجھتے حق تلفی کر کے کھا جاؤ۔

آنحضرت صلعم نے رشوت لینے اور دینے والے دونوں شخصوں کی مذمت کی، آپ نے حاکموں کو خاص طور سے اس سلسلہ میں ہدایات دیں یہاں تک کہ رعایا سے تحفہ تحائف لینے کی بھی انہیں اجازت نہیں دی۔

شریعت اسلامی نے کسی کا مال دبا جانے اور اس میں خیانت کرنے سے منع کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ہدایات اور اخلاقی تعلیمات کے ذریعہ ہر قسم کی خیانت اور بددیانتی سے روکا آپ نے منافق کی تین علامتوں میں سے ایک علامت یہ بھی بتائی کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرتا ہے

خیانت کی ایک خاص قسم "غلول" ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز کئی آدمیوں کے درمیان مشترک ہو اور تقسیم نہ ہوئی ہو لیکن کوئی فریق دوسرے شرکاء سے چھپا کر اس میں سے لیلے ایسا خاص طور پر اس وقت ہوتا تھا جب مال غنیمت حاصل ہوتا اور امیر وکبیر اس میں تقسیم سے پہلے ہی تصرف شروع کر دیتے تھے اس لئے غلول سے بھی منع کیا گیا۔ قرآن میں ہے

وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (آل عمران ۱۶۱)

اور جو کوئی خیانت کرے گا تو وہ قیامت کے دن اپنی خیانت لے کر آئے گا۔

ناپ تول میں کمی بیشی کر کے بھی دوسروں کا مال ہڑپ کیا جاتا ہے دوکانداروں اور بیوپاریوں کی عام ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ خود فروخت کرتے ہیں تو وزن میں کمی کرتے ہیں اور جب دوسرں سے چیزیں خریدتے ہیں تو زیادہ تول کر لیتے ہیں۔ اس لئے قرآن پاک نے اس ناجائز کاروبار کی جس کے ذریعہ عام طور سے غریبوں کی حق تلفی ہوتی ہے بڑی شدت سے مخالفت کی ہے۔ فرمایا۔

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ

اور ناپ تول پورا دو اور (اس میں) کم کر دینے والے نہ بنو اور تولو سیدھی ترازو سے اور لوگوں کو

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (شعراء ۱۸۱-۱۸۳)

ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد مچاتے مت پھرو۔

سورۂ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں ان میں سے یہ بھی ہے۔

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (بنی اسرائیل ۳۵)

اور جب ناپو تو پورا تولو اور سیدھے ترازو سے تولو یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے۔

اس معاملہ کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے بڑی وضاحت سے اس پر نکیر فرمائی۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ (مطففین ۱-۴)

خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جو (ناپ تول میں) کمی کرتے ہیں اور جو لوگوں سے پورا پورا تول کر لیتے ہیں (لیکن) جب خود تول یا وزن کر کے دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا انہیں اس کا خیال نہیں کہ انہیں ایک بڑے سخت دن کے لئے اٹھایا جائے گا۔

غرضیکہ ناجائز طریقہ سے جس طرح بھی دوسروں کا مال لیا جائے اسلام اسے حرام قرار دیتا ہے۔

## عزت و آبرو کی حفاظت

جان و مال ہی کی طرح انسان کو اس کی عزت و آبرو بھی نہایت عزیز اور محبوب ہوتی ہے۔ بلکہ ایک خوددار آدمی جان و مال کا ضیاع برداشت کر سکتا ہے لیکن عزت و ناموس پر کسی قسم کا دھبہ لگنا پسند نہیں کر سکتا۔ اسلام کو انسان کے اس جذبہ اور احساس کا پورا اندازہ ہے اس لئے اس نے عزت و وقار پر بٹہ لگنے والی ہر ہر چیز بلکہ اس کے شائبہ تک کی روک تھام کی ہے۔ زنا بدکاری، بہتان، الزام تراشی اور انسانی آبرو اور حرمت کو ضرر پہنچانے والی ہر ہر چیز کو وہ سنگین بتاتا ہے۔

انسانی عزت و وقار کے لئے سب سے زیادہ کھلا ہوا چیلنج اور معاشرت و سوسائٹی کے دامن پر سب سے بدنما داغ اور دھبہ زنا ہے اسلام زنا کا بھی مخالف ہے اور زنا کے اسباب و محرکات کا بھی تاکہ انسان کی عفت و پاکدامنی پر کہیں سے بھی حرف نہ آسکے۔ زنا کے متعلق فرمایا:۔

لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ۔ وَسَآءَ سَبِیْلًا (بنی اسرائیل ۳۲)
زنا کے قریب نہ پھٹکو بیشک وہ بدکاری اور غلط راستہ ہے

خدائے رحمان کے پاکیزہ بندوں کا ایک وصف یہ بتایا گیا ہے کہ وہ زنا نہیں کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید کی گئی کہ جب مومن عورتیں آپ سے بیعت کے لئے حاضر ہوں تو وہ شرک و کفر کی طرح زنا سے بھی اپنی دستبرداری کا اعلان کریں تو ان سے بیعت کر لیجئے۔ کنوارے زناکار مرد و عورت کی سزا یہ بتائی کہ انہیں سو کوڑے لگائے جائیں اور اگر شادی شدہ ہوں تو سنگسار کئے جائیں جیسا کہ اوپر گذرا زنا اور شہوت کو دعوت دینے والی جتنی چیزیں ہو سکتی ہیں سب سے شریعت اسلامی نے آدمی کو منع کیا ہے۔

اسی طریقے سے کسی بے گناہ کو جان بوجھ کر مجرم بنانے کی کوشش کرنا اور اس پر غلط الزام عائد کرنا بہتان لگانا بھی بڑی معصیت ہے۔ چونکہ اس کا مقصد بھی لوگوں کو بدنام کرنا اور ان کی عزت و وقار پر حملہ کرنا ہے۔ اس لئے قرآن پاک نے اس سے بھی سختی سے روکا۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُہْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا (احزاب ۵۸)
جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو ان کے بن کئے (الزام) لگا کر تکلیف پہنچاتے ہیں، وہ بہتان اور واضح حق تلفی کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

بعض لوگ خود مجرم ہوتے ہیں مگر وہ اپنا جرم دوسروں کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں اس قسم کے لوگوں کے بارہ میں فرمایا۔

وَمَنْ یَّکْسِبْ خَطِیْٓـئَۃً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ یَرْمِ بِہٖ بَرِیْٓـئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُہْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِیْنًا (نساء ۱۱۲)
اور جس نے خطا یا گناہ کا ارتکاب کیا اور پھر اس نے اس کی تہمت بے قصور پر لگائی تو اس نے بہتان اور واضح حق تلفی کا بار اپنے اوپر لادا۔

اس قسم کی مذموم حرکت کرنے والوں کی قانونی سزا یہ مقرر کی کہ۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَۃِ شُہَدَآءَ فَاجْلِدُوْہُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَۃً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَہُمْ
جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو ان کو اسی درے مارو اور پھر کبھی ان کی گواہی قبول

شَهَادَةً اَبَدًا (نور ۴) نہ کرو۔

بعض لوگ دوسروں کو متہم اور بدنام کرنے کے لئے مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کا مذاق اڑانا، برے القاب دینا ان کی غیبت کرنا، چغلی کھانا وغیرہ اور ان سب کا مقصد جہاں ان کی روح کو صدمہ پہنچانا ہے۔ وہیں انہیں بدنام اور بے عزت کرنا بھی ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے ہدایت کی ہے کہ:۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰی اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (حجرات ۱۱)

ایمان والو! کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہو۔ نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور اپنے بھائیوں کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کے برے نام رکھو۔

غرضیکہ انسان کی عزت، آبرو اور حرمت کا اسلام نے جس قدر خیال رکھا ہے۔ اس کا تصور بھی دوسرے مذاہب نہیں پیش کر سکتے۔

ان تینوں چیزوں یعنی جان، مال اور ناموس کی حفاظت کا معاملہ نہایت اہم ہے اور انسان کو اس کے ان حقوق سے محروم کر دینا اس کی سب سے بڑی حق تلفی ہے۔ اس لئے اسلام نے ان تینوں کی حفاظت کی پوری ضمانت دی ہے اور ایک مسلمان کی اصلی نشان یہ بتلائی گئی ہے کہ اس کے ہاتھوں اور زبان سے کسی مسلمان کو دکھ نہیں پہنچتا۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ لوگوں کی جان، مال اور عزت و آبرو اسی طرح محترم اور معزز ہیں جس طرح آج کا دن اور خانۂ کعبہ کی سرزمین محترم ہے۔

(باقی)

---

اقتباسات و تراجم

ادارہ اجمل باغ

# سائنس کا اعترافِ حقیقت

"یہ مضمون کریسی موریسن (CRESSY MORRISON) سابق صدر نیویارک سائنس اکیڈمی کے ایک مقالہ کا ترجمہ ہے جس میں مصنف نے وہ سات باتیں بتائی ہیں، جنکی بنا پر ایک سائنسدان کو خدا پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اس مضمون سے لوگوں کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے کثیر الاشاعت ماہنامہ ریڈرز ڈائجسٹ نے اسے فرمائش پر دو مرتبہ شائع کیا۔" ادارہ

یہ دَور جس میں سے ہم گزر رہے ہیں سائنسی انکشافات و ایجادات کا دور ہے جوں جوں سائنس کی ترقی کا مہر عالمتاب بلند ہوتا جا رہا ہے اُس کی روشنی سے ہر غور و فکر کرنے والے قلب میں یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ جاگزین ہوتی چلی جا رہی ہے کہ کائنات کی تخلیق کسی حکیم مطلق کے ارادہ کی مرہونِ منت ہے۔ ڈاروِن کے زمانہ سے لے کر اب تک پچھلے نوّے سالوں میں ہم نے قدرت کے بہت سے سربستہ رازوں کو کھولا ہے اور متعدد انکشافات کئے ہیں۔ ایک ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ یہ علم و انکشافات ہمیں خدا کی معرفت سے قریب تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔

جہاں تک میرے غور و فکر کا تعلق ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب و وجوہ کی بنا پر میں خدا پر ایمان لانے پر مجبور ہوں۔

۱۔ ریاضی کے غیر متبدل قانون سے ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ ہماری یہ کائنات ایک بہت بڑے مُدبّر حکیم نے بنائی ہے۔

—— فرض کیجئے آپ دس ٹکیاں جس پر ایک سے لے کر دس تک نمبر لگے ہوئے ہیں، اپنی

جیب میں ڈالتے ہیں اور انہیں آپس میں اچھی طرح خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اب آپ جیب میں ہاتھ ڈالیں اور ایک نمبر والی اکنی نکالنے کی کوشش کریں۔ ایسا کرنے کے بعد آپ اسے دوبارہ جیب میں گرا دیں اور سب کو ایک مرتبہ پھر ہلا جلا کر اب دو نمبر والی اکنی نکالنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح سے اس عمل کو دہراتے ہوئے آپ دسوں اکنیاں نکالنے کی کوشش کریں۔

علم ریاضی کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے ایک نمبر والی اکنی صحیح نکالنے کا امکان دس میں ایک ہے۔ ایک نمبر والی اور دو نمبر والی اکنیاں صحیح نکالنے کے امکانات سو میں ایک کے برابر اور ایک نمبر والی، دو نمبر والی اور تین نمبر والی اکنیاں صحیح نکالنے کے امکانات ایک ہزار میں ایک کے برابر ہیں۔ اس طرح آپ کے دسوں اکنیوں کو صحیح نکالنے کے امکانات ناقابل یقین حد تک کم ہو جاتے ہیں یعنی دس ارب میں صرف ایک۔

اس کے بعد اب آپ دیکھیں کہ ہر جاندار کو زمین پر زندگی گزارنے کے لئے ایک خاص ترتیب و ترویج کے ساتھ بے شمار چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ سب اُسے اپنے اپنے وقت پر ملتی رہتی ہیں۔ کون سر پھرا اسے نظام ربوبیت نہیں کہے گا؟ اسے اصلاح اور حکمت سے بھرا ہُوا ایک کارنامہ نہیں کہے گا۔ اور اسے ایک اتفاقی حادثہ کا نام دے گا۔

——— زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے۔ اگر یہ اسکی بجائے صرف ایک سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومنا شروع کر دے تو نتیجہ کے طور پر ہمارے دن اور رات آج سے دس گنا لمبے ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو سورج زمین پر اتنا طویل عرصہ مسلسل چمک کر یہاں کی روئیدگی کو جلا دیتا اور اگر اتفاق سے کوئی چیز بچ رہتی تو رات کے طویل گھنٹے اسے سردی سے جما دیتے۔

——— پھر سورج ہی کو لو جو ہماری زندگی کے لئے ایک عظیم ضرورت کا درجہ رکھتا ہے اس کی سطح کا درجۂ حرارت 12000 درجہ فارن ہیٹ ہے۔ ہماری زمین اس سے اس قدر دوری پر واقع ہوئی ہے کہ یہ اسے اس کی حقیقی ضرورت کے مطابق گرمی پہنچا رہا ہے۔ نہ اسے جلا تا ہی ہے اور نہ سردی سے جمنے ہی دیتا ہے۔ سورج اگر ہماری روزمرہ کی گرمی سے صرف نصف حصہ روک لے تو ہم جم جائیں اور اگر یہ اُسے صرف دو گنا کر دے تو ہم بھن جائیں۔

——— زمین اپنے Axis پر ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتی ہوئی گھوم رہی ہے اور اس کی حرکت سے ہمیں سال بھر میں مختلف موسم حاصل ہوتے ہیں۔ اگر اس کا یہ جھکاؤ نہ ہوتا تو سمندر کے بخارات شمال اور جنوب کی طرف جاتے اور ہر طرف برف ہی برف ہوتی۔

——— زمین کی جلد (CRUST) اگر دس فٹ اور زیادہ موٹی ہوتی تو ہم آکسیجن سے محروم ہو جاتے اور کسی جاندار کا زندہ رہنا ممکن نہ رہتا۔

——— ہمارا ہوائی کرہ اگر نسبتاً کم موٹا ہوتا تو شہاب ثاقب جو کروڑوں کی تعداد میں روزانہ اوپر سے نیچے گر رہے ہیں اور اسی کرہ کے اندر بھسم ہو رہے ہیں ان میں سے بہت سے ہماری زمین تک پہنچ جایا کرتے اور ہر طرف آگ ہی آگ بھڑک اٹھتی۔

یہ چند موٹی موٹی مثالیں ہیں غور و فکر کی گہرائیوں میں جتنا زیادہ اترتے جاؤ گے ایسی بےشمار چیزیں سامنے آتی جائینگی۔ ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ اس چیز کا دس لاکھ میں سے ایک کا بھی امکان نہیں ہے کہ دنیا محض ایک حادثہ کے طور پر وقوع میں آگئی ہے۔

۲۔ زندگی میں اپنا مقصد حاصل کر سکنے کی اہلیت اور طاقت ہی اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اسے ایک ہمہ بین و ہمہ دان ہستی نے بنایا۔

مجرّد زندگی کیا ہے؟ کوئی شخص آجتک اس کا صحیح اندازہ نہ کر سکا۔ یہ نہ وزن رکھتی ہے اور نہ حجم، لیکن یہ طاقت ضرور رکھتی ہے۔ ایک ابھرتی ہوئی جڑ کبھی کبھی چٹان میں بھی شگاف پیدا کر دیا کرتی ہے۔ زندگی نے نہ صرف پانی ہوا اور زمین پر فتح حاصل کی ہے، بلکہ ان پر اسے یہاں تک غلبہ حاصل ہو گیا ہے کہ یہ ان کے باہم گہرے مربوط اجزاء کو غیر مرتب کر کے پھر انہیں از سر نو ترکیب دے سکتی ہے۔

تقریباً نظر نہ آنے والے پروٹوپلازم (PROTO PLASM) کے قطرے کو دیکھو یہ شفاف جیلی کی طرح کا حرکت پذیر قطرہ سورج سے توانائی حاصل کرتا ہے۔ یہ کہر کی طرح کا چھوٹا سا شفاف قطرہ اپنے اندر زندگی کا جرثومہ رکھتا ہے اور پھر یہ طاقت بھی رکھتا ہے کہ اسے ہر بڑی یا چھوٹی میں منتقل کر دے اس ایک چھوٹے سے قطرے کی طاقت مجموعی طور پر دنیا بھر کے نباتات اور حیوانات کی طاقت سے زیادہ ہے کیونکہ زندگی سب نے وہیں سے پائی۔

آگ سے جھلسی ہوئی چٹانیں یا سمندر یہ کام نہیں کر سکتے تھے ۔۔۔۔۔۔۔۔

..... پھر اس قطرے کو کون لایا؟

۳۔ جانوروں کے اندر عقل وفہم کا جو مادہ پایا جاتا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انہیں ایک علیم و خبیر اور ساتھ ہی رحیم و کریم خدا نے پیدا کر کے ان کے اندر یہ مادہ ودیعت فرمایا۔ ورنہ اس کے بغیر وہ محض بیچارگی ہوتے۔

سیلمن (SELMON) مچھلی سالہا سال سمندر میں گذارتی ہے لیکن اپنے وقت مقررہ پر وہ خود ہی سمندر سے دریا میں اور دریا سے اُسکی اس شاخ میں پہنچ جاتی ہے جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ وہ کیا چیز ہے جو عین اس مقام تک اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ اگر تم اُسے دریا کی کسی دوسری شاخ میں چھوڑ دو تو وہ فوراً سمجھ جائیگی کہ وہ کسی غلط مقام پر آگئی ہے۔ وہ وہاں سے پھر بہاؤ کے خلاف بڑے دریا میں پہنچے گی۔ اور وہاں سے اپنی اُسی شاخ میں جا پہنچیگی۔

ایل مچھلی (EALS) کا معاملہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ جب یہ جانور کسی قدر بڑے ہو جاتے ہیں تو تالابوں، جھیلوں اور دریاؤں سے نقل مکانی کر جاتے ہیں۔ یورپ میں یہ جانور سمندر کے ہزاروں میل طے کر کے برموڈا (BERMUDA) کے قریب پانی کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں وہ انڈے دیتے اور مر جاتے ہیں۔ جب بچے پیدا ہوتے ہیں تو اگرچہ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ انکے ماں باپ کہاں سے آئے تھے وہ واپس جاتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ اسی ساحل سمندر پر پہنچ جاتے ہیں جہاں سے ان کے ماں باپ سمندر میں داخل ہوئے تھے۔ بلکہ وہاں سے اپنی جھیلوں، دریاؤں اور تالابوں تک میں پہنچ جاتے ہیں۔

بھڑ کی ایک قسم جب انڈا دینے کے قریب ہوتی ہے تو وہ ایک ٹڈے کو پکڑ لیتی ہے اور اس کے ٹھیک ایسے مقام پر ڈنک مارتی ہے جس سے وہ مرتا نہیں صرف بیہوش ہو جاتا ہے اور محفوظ گوشت کا کام دے سکتا ہے۔ اب یہ بھڑ ایک سوراخ میں انڈے دیتی ہے اور اُس بیہوش ٹڈے کو انڈوں کے ساتھ ایسے قرینے سے رکھتی ہے کہ جب انڈوں سے بچے نکلیں تو اس کو آسانی کے ساتھ کھانا شروع کریں مگر اس طرح سے کہ وہ کیڑا مرنے بھی نہیں۔ کیونکہ مردہ کیڑے کا گوشت ان بچوں کے لئے ہلاک ہوتا ہے یہ کام کرنے کے بعد وہ بھڑ مر جاتی ہے اور اپنے بچوں کو جن کے لئے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا کبھی نہیں دیکھ سکتی۔

جانوروں کے اندر اتنی مجرد دماغی قوت کا پایا جانا کسی طرح بھی بلا وجہ یا اتفاقی طور پر نہیں ہو سکتا۔

۴۔ انسان کے اندر دوسرے حیوانات کی بہ نسبت عقل و تمیز کا مادہ یعنی تفکر و تدبر اور استدلال کی قوتیں بہت زیادہ رکھی گئی ہیں۔

آج تک کبھی نہیں سنا کہ کوئی حیوان دس تک گن سکتا ہے یا دس کے معنی ہی جانتا ہے۔ حیوانی جبلت سارنگی کے ایک سُر کی طرح ہے جو بہت اچھا سُر ہو مگر محدود ہو۔ لیکن انسانی دماغ میں پورے آرکسٹرا کی دھنیں موجود ہیں۔

میں اس نکتہ کو زیادہ پھیلانے کی ضرورت نہیں پاتا۔ ہم جو کچھ ہیں، وہ اسی وجہ سے ہیں کہ کائناتی عقل کے نیر درخشاں نے اپنے بصارت سوز نور میں سے ایک چھوٹی سی کرن ہمیں بھی عطا کی ہے۔

۵۔ مسلسل تجربات سے ہم نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ حیاتی خلیے کہاں ہوتے ہیں اور ان کے حجم نما وظائف کیا ہیں۔ ڈارون کے زمانہ میں یہ علم ابھی ناپید تھا۔

یہ زندگی بخش جواہر اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کی ماہیت کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس وقت دنیا میں جہاں جہاں بھی اور جتنی بھی زندگی پائی جاتی ہے اگر اس سب زندگی کی اصل یعنی اس کے خلیات کو یکجا کر کے انہیں ایک انگشتانہ میں ڈالا جائے تو وہ اسکے اندر بھی تھوڑی سی جگہ گھیریں گے لیکن یہ خلیے دنیا کی ہر جاندار چیز کو وجود میں لانے کے بلا شرکت غیرے ذمہ دار ہیں۔ ہر جاندار کی زندگی میں جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں، وہ جن ادوار میں سے گذرتا ہے اور اس کے اندر جس قدر خصائص اور جتنی صلاحیتیں ہوتی ہیں وہ سب اسی حیا تیاتی خلیے ہی کی نمود ہوتی ہے اور یہی خلیہ زندگی کے متعدد عنوانات کا مصدر و مخزن ہوتا ہے۔ یہ خلیے اپنے اس چھوٹے سے حجم میں ایک جاندار کے آباؤ اجداد کی لاتعداد روایات، عادات، خصوصیات، جسمانی تشکیل و عوارضات اور دیگر ان گنت خصائل کو کس طرح بند کر لیتے ہیں۔ اب ہم صحیح اور واضح طور پر کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے ارتقا کا نقطۂ آغاز یہ ہے نہ کہ ڈارون کی تھیوری۔

یہ کیونکر ہے کہ صرف چند لاکھ ایٹم باہمدگر مربوط جواہر حیات کی شکل میں کائنات کی پوری زندگی پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ اس ایک توجیہ کے سوا کہ یہ سب کچھ ایک بہت بڑے حکیم کی حکمت کے مظاہر ہیں۔ اس کی اور کیا توجیہ کی جا سکتی ہے؟

ہے۔ قدرت نے جس طرح اپنی کائنات کی حیثیت کا سامان کیا ہے۔ اسے دیکھ کر ہر شخص یہ
سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ لازمی ایک عقل کُل اور حکیم مطلق کے سوا کسی دوسرے خالق کی تخلیق نہیں
ہیں۔ انہیں اس نے بنایا ہے جس کی نظر لامحدود ہے اور جو ہر ڈھکے اور چھپے کو جاننے والا ہے۔
بہت پرانی بات ہے کہ ایک دفعہ آسٹریلیا میں کیکٹس پودے کی ایک قسم کو حفاظتی باڑ کے لئے
کاشت کیا گیا۔ اتفاق سے آسٹریلیا میں اُس وقت اس پودے کا کوئی دشمن کیڑا بھی موجود نہ تھا۔ بس پھر
کیا تھا۔ یہ بڑھنا شروع ہو گیا اور لوگوں کے نہ چاہنے کے باوجود نہایت عجیب و غریب طریق پر بڑھتا چلا گیا
حتیٰ کہ جلد ہی اس نے جزیرہ برطانیہ کے رقبہ کے برابر رقبہ گھیر لیا۔ اب ہر طرف ہراس پھیل گیا۔ لوگوں کے
نسبی خادم اُجڑ گئے شہروں میں باغات اور گھروں کے اندر یہ پودا گھس آیا اور بعض جگہوں میں لوگوں کو
بستیاں چھوڑنا پڑیں۔ حکومت کا محکمہ حشریات (ENTOMOLOGY) پوری طاقت سے اس بلا کے دفعیہ کی طرف
متوجہ ہو گیا۔ چنانچہ یہ لوگ اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے پوری دنیا میں پھرے۔ آخر انہیں
ایک ایسے کیڑے کا پتہ لگ گیا۔ جس کی خوراک یہی پودا تھا اور اس کی نسل کشی بھی بڑی تیزی کے ساتھ
ہوتی۔ اس کیڑے کے استعمال کے بعد اب تک آسٹریلیا میں کیکٹس کے پودے صرف مطلوبہ تعداد میں موجود ہیں۔
اس طرح وہ مُہلک گیر تباہی ختم ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی کیکٹس خور کیڑوں کی بہت بڑی تعداد خود بخود ختم
ہو گئی صرف اتنی تعداد باقی رہ گئی جو اس پودے کو بے تحاشا پھیلنے سے روکے رکھے۔
اس قسم کے امتدادی اور اصلاحی عوامل کائنات کے ہر شعبے میں مصروف کار ہیں۔
یہ کیوں ہے کہ وہ کیڑے جن کی پرورش نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ہو رہی ہے پوری
زمین پر نہیں چھا جاتے — یہاں بھی قدرت نے ایک روک لگا رکھی ہے اس قسم کے جملہ
حشرات الارض اور نباتاتی اور حیواناتی کیڑوں کو قدرت نے پھیپھڑوں سے محروم رکھا ہوا ہے۔ یہ
نالیوں کے ذریعے سانس لیتے ہیں، پھر قدرت نے یہ بھی بندوبست کیا ہے کہ ان کے جسموں میں
بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ لیکن ان کی سانس لینے والی نالیوں کو جسم کی بہ نسبت بہت ہی کم بڑھنے
دیا ہے۔ چنانچہ نتیجہ کے طور پر یہ کیڑے جسامت میں نہیں بڑھ سکتے۔ اگر یہ روک پیدا نہ کی جاتی
تو انسان کے لئے دنیا میں رہنا دشوار ہو جاتا۔
عقل و خرد کی ... کا سب سے بڑا ثبوت میرے خیال میں یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں ... ہوتا ہے

اس کائنات میں صرف انسان ہی ہے جس کی روحانی طاقت اس کے دل میں اللہ تعالےٰ کا تصور پیدا کرتی ہے۔ اس طاقت کو ہم غور و فکر کا نام دے سکتے ہیں اس غور و فکر اور تفکر فی آیات اللہ سے انسان کے اندر اتنی زبردست روحانی بلندیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ اس کیفیت میں ان دیکھی چیزوں کی حقیقت جان لیتا ہے۔ یہ طاقت ایک انسان کے سامنے کشفِ حقائق کا ایک وسیع میدان کھول دیتی ہے۔ اس کے قلبی تصورات روحانی حقائق کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اسے آفاق و انفس کی لا تعداد نشانیوں سے اللہ تعالےٰ کی ذات کی گواہی ملتی ہے۔ وہ یہ جاننے لگتا ہے کہ خدا ہر چیز میں ہے، ہر جگہ ہے اور سب سے زیادہ وہ ہمارے دلوں کے قریب ہے۔

عام غور و فکر اس نظریہ کے حق میں جتنی گواہی دیتی ہے۔ سائنس بھی اس کی اسی قدر تائید کر رہی ہے۔

---

## تقریظ و تنقید

# تحقیق مزید بہ سلسلۂ خلافت معاویہؓ و یزیدؒ

تالیف : محمود احمد عباسی

صفحات : ۵۱۲ قیمت : آٹھ روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ محمود ۲۶/۱ بی ایریا لالوکھیت کراچی۔
و مکتبہ علم و حکمت سوتر منڈی لاہور

آج سے دو سال قبل بہت کم لوگ محمود احمد عباسی صاحب کو جانتے تھے لیکن اب اہل علم کے طبقوں سے وابستہ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا آدمی ہوگا جو عباسی صاحب اور آپکی شہرہ آفاق تصنیف "خلافت معاویہ و یزید" سے بے خبر ہو۔ یہ کتاب ایک ایسے نازک مسئلہ سے متعلق تھی جس کے ساتھ لوگوں کو عقلی سے زیادہ جذباتی اور سیاسی دلچسپی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر حلقوں سے اس کی شدید مخالفت ہوئی اور فی الواقع ایسی شکل پیدا ہوگئی کہ اسکی تعریف کرنا خواہ مخواہ اپنے لئے مشکلات کے دروازے کھول لینے کے مترادف بن گیا۔ ہمارے نزدیک گروہی عصبیتوں یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اگر کسی محققانہ تصنیف کی مخالفت کی جائے یا اس کے مصنف کی حوصلہ شکنی کی جائے تو یہ خود علم کی بیقدری ہے۔ پھر اس بے قدری کے ذمہ دار جب خود اہل علم ہوں تو اسکی قباحت دوچند ہو جاتی ہے۔ لیکن چیز اچھی ہو تو اپنا وزن منوا کے رہتی ہے۔ چنانچہ عباسی صاحب کی کتاب نے بھی ان تمام مخالفتوں کا مقابلہ کرکے اپنا مقام اب تسلیم کرا لیا ہے۔

"خلافت معاویہ و یزید" کا بنیادی نقطۂ نظر، جیسا کہ "میثاق" کے قارئین جانتے ہوں گے، یہ ہے کہ حادثہ کربلا کے جو واقعات شیعہ ذاکروں کی زبان سے سُنے جاتے ہیں یا عام تاریخ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں وہ من و عن صحیح نہیں ہیں بلکہ ان کے بیان میں بہت سی حقیقتوں پر پردہ ڈال کر من گھڑت قصوں کا سہارا لیا گیا ہے عباسی صاحب نے تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر ان من گھڑت قصوں کی حقیقت واضح

کر دی ہے اور جو اصل حقائق ہیں ان کو نہایت وضاحت اور بہایت مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

ہمارے نزدیک فاضل مصنف کے یہ نتائج تحقیق اتنے نادر نہیں جتنے نادر بجھ کر ان کے مخالفین نے درجنوں کتابیں ان کے خلاف تصنیف کر ڈالی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ فاضل مصنف نے خلافت راشدہ کے آخری دور اور بنی امیہ کے زمانہ کی تاریخ کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے نتائج تحقیق اتنے جزم اور اعتماد کے ساتھ پیش کئے ہیں اور اپنے دلائل کا اس قدر انبار لگا دیا ہے کہ انہیں مسئلہ زیر بحث میں پچھلے محققین کے پہلو بہ پہلو ایک مستند کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ 'خلافت معاویہ و یزید' اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جو امام ابن تیمیہ وغیرہ کے نقطۂ نظر کو نسبتاً زیادہ منقح صورت میں پیش کرتی ہے۔

'خلافت معاویہ و یزید' کو پڑھ کر ہم اس رائے کو بالکل مبنی بر انصاف نہیں سمجھتے کہ عباسی صاحب نے ذہن میں پہلے سے یزید کی پاکدامنی اور حضرت حسینؓ کے موقف کی غلطی کا تصور بٹھا لیا ہے اور بعد میں اسے ثابت کرنے کے لئے اپنی مرضی سے دلائل جمع کرنے شروع کر دیئے ہیں اور حتیٰ کہ اگر انہوں نے ضرورت محسوس کی ہے تو بعض اقتباسات کی قطع و برید کرنے سے بھی باز نہیں آئے ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ فاضل مصنف نے یہ کتاب ایک غیر جانبدار محقق کی حیثیت سے تحریر کی ہے۔ انہوں نے ہر واقعہ کی صرف وہی توجیہ قبول کی ہے جو ان کی تحقیق کے کڑے معیار پر پوری اتر سکی ہے۔

ہمارے نزدیک اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کا اونچا معیار تحقیق ہی ہے۔ عباسی صاحب نے نہایت محنت کر کے ان لوگوں کا سراغ لگا لیا ہے جن کے ذریعہ سے ہماری تاریخ میں بہت سی بے سروپا باتیں داخل ہوئی ہیں اور فتنوں کا موجب بنی ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق حادثہ کربلا سے متعلق جو روایات زبان زد عوام ہیں وہ بیشتر محمد بن السائب کلبی، ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی اور ہشام بن محمد کلبی کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ ائمہ حدیث و رجال نے ان تینوں راویوں کو کٹر رافضی، کذاب اور غیر معتبر قرار دیا ہے۔ فاضل مصنف جب واقعات کربلا کی اس معروف بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتے تو جب تک کوئی دوسرا محقق ان راویوں کی ثقاہت و امانت کو پہلے ثابت نہ کر دے عباسی صاحب کی کسی دلیل کو توڑنا اس کے لئے ممکن نہیں۔

زیر نظر کتاب 'تحقیق مزید' 'خلافت معاویہ و یزید' ہی کے سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ فاضل مولف نے اس کتاب میں [illegible] اٹھائی ہیں۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ ازواج مطہرات کے

علاوہ ہو سکتے ہیں سو صحابہؓ (جن میں اصحاب عشرہ مبشرہ، بدری صحابہ اور اصحاب بیعت الرضوان کی بھی خاصی تعداد شامل ہے) کے مختصر احوال لکھے ہیں جو یزید کی ولیعہدی اور خلافت کے زمانہ تک بقید حیات تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی حضرت حسینؓ کے موقف کی تائید نہیں کی۔ یہاں فاضل مؤلف ایک قاری کے لئے دو راہیں متعین کر دیتے ہیں یا تو وہ حضرت حسینؓ کے موقف کو صحیح سمجھے اور ان تمام صحابہؓ و صحابیاتؓ کو معاذ اللہ عزیمت سے عاری یا مداہنت کے مرتکب قرار دے یا اس کے برعکس یہ رائے قائم کرے کہ حضرت حسینؓ کو صحیح موقف متعین کرنے میں اضطراب پیش آیا۔ عباسی صاحب یہی دوسرا نقطۂ نظر بدلائل پیش کرتے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے سلسلہ میں طالبین قصاص نے جو جدوجہد کی اور اس کے نتیجہ میں ہولناک جنگیں ہوئیں، فاضل مصنف کی تحقیق میں اسے ناکام بنانے میں سبائیوں کا زبردست ہاتھ تھا۔ وہ چونکہ حضرت علیؓ کے لشکر میں بکثرت موجود تھے۔ اس لئے قصاص کی کسی بھی تحریک کے آڑے آتے تھے چنانچہ حضرت علیؓ اس مطالبہ کے پورا کرنے پر قادر نہ ہو سکے اور قصاص بالآخر امیر معاویہؓ نے لیا۔ اس بحث کے ضمن میں پہلی بار عباسی صاحب نے ان وضعی روایات کی قلعی کھولی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ طلب قصاص کی جدوجہد میں نکلنے پر ہمیشہ نادم رہا کرتی تھیں — اس بحث میں حضرت معاویہؓ کا رول ہم پر واضح نہیں ہو سکا۔ فاضل مؤلف کے نزدیک اس زمانہ کی خانہ جنگی طلب قصاص ہی کے مسئلہ پر ہوئی، مسئلہ خلافت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر معاویہؓ حضرت علیؓ کی خلافت کو قائم خلافت سمجھتے تھے تو ان کے ساتھ ان کی آویزش کس بنیاد پر تھی؟ اور شام میں ان کی حکومت کیا اس خلافت کے متوازی نہیں ہو گئی تھی، جسے وہ خود قائم خلافت تسلیم کرتے تھے ایک اور سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھی صحابہؓ حضرت علیؓ کی قائم خلافت غیر مشروط طور پر تسلیم کر کے ان کے ہاتھ مضبوط کرتے تو کیا حالات اتنے دگرگوں ہو گئے تھے کہ سبائی ملک کی سیاست پر اسی طرح چھائے رہتے جس طرح تاریخ اب انہیں دکھاتی ہے؛ وقتی طور پر ایک ہنگامہ کھڑا کر دینا آسان ہوتا ہے لیکن اسے سالہا سال تک قوم کی مرضی کے خلاف مسلط رکھنا بالکل ناممکن تھا یہاں یہ بحث بھی غور طلب ہے کہ حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد کیا مدینہ [illegible]
[illegible]

نے مخزومی کے علم کو وقت کے اشتہارات سے باہر رکھا ہو تو کیا اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے؟
بہرحال اس بحث میں یہ چند سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب اس کتاب کے صفحات سے تبصرہ نگار کی سمجھ میں نہیں آسکا۔

کتاب کے ایک باب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شروع سے اہل بیت میں موروثی خلافت کا تصور پیدا ہو گیا تھا اور انہوں نے برابر اس بات کی کوشش کی کہ وہ خلافت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ فاضل مصنف نے چوتھی صدی ہجری کے وسط تک قائم خلافتوں کے خلاف علویوں کے چھیاسٹھ خروج بیان کئے ہیں۔ مصنف نے بتایا ہے کہ علویوں کی اس سلسلہ کی کوششوں کا اتنا چرچا تھا کہ بعض تحریکیں اگر بغاوت کی خاطر بھی اٹھتیں تو ان کے بانیوں نے بھی اپنا حسب و نسب علوی ہی بتایا حالانکہ علوی نہ ان کے حق میں تھے اور نہ سیاسی طور پر ان سے متفق تھے۔

اس کتاب میں بے شمار انکشافات ایسے ہیں جو تاریخ کے طالبعلموں کے لئے یقیناً تعجب خیز ہوں گے مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش میں نمایاں حصہ زبیر بن عبدالمطلب کا تھا نہ کہ ابو طالب کا۔ زبیر بن عبدالمطلب کی وفات کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نوجوان تھے۔ ابو طالب کا حضورؐ سے تعلق قبیلہ کی سربراہی کا تھا۔ حضورؐ کی بعثت کے وقت حضرت علیؓ کی عمر صرف [illegible] برس تھی۔ حضرت حسینؓ کی ازواج میں شہر بانو نام کی کوئی ایرانی شہزادی نہ تھی۔ علی زین العابدینؒ کی والدہ سندھی خاتون تھیں وغیرہ وغیرہ

ایک بات جو ہم نے محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ مصنف جن روایات سے خود استفادہ کرتے ہیں ان کے حسن و قبح یا معیار صحت پر کوئی رائے زنی نہیں کرتے۔ حالانکہ جب وہ خلاف مقصد روایات پیش کرتے ہیں تو ان پر ہر لحاظ سے بحث کرتے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ انہیں ایسی تمام روایات کی صحت پر بھی بحث کرنی چاہیے تھی جن سے وہ معروف نظریات کے خلاف استدلال کرتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے نزدیک مجموعی طور پر مصنف نے نہایت اعتدال سے کام لیا ہے اور کتاب میں مناظرہ بازی کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دی ہے۔ لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ فاضل مصنف نے تحریر میں بعض اوقات ایسی چیزیں بھی پیش کر دی ہیں جن کی ضرورت نہیں تھی اور اگر ان سے صرف نظر بھی کر لیا جاتا تو مصنف کے استدلال کی قوت قائم رہتی۔ [illegible]
[illegible]

سے ہمارا سیاسی قارئین پر یہ ثابت کیا جائے کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو ہر اعتبار سے بہت بلند سمجھتا ہو۔

مندرجہ بالا بحثیں کتاب کے تین سو صفحات کو محیط ہیں۔ آخری دو سو صفحات میں ان اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو "خلافت معاویہ ویزید" کے بارے میں اٹھائے گئے تھے۔ یہ تمام بحثیں پہلے شائع ہو چکی ہیں اور ان کا صرف ایک حصہ خود مصنف کا لکھا ہوا ہے۔ باقی دوسرے اہل قلم کا ہے۔ ہمارے نزدیک کتاب کے شایانِ شان طرزِ عمل یہ ہوتا کہ پہلی کتاب کے جو حصے بحث ونظر کا سبب بنے تھے، نئے ایڈیشن میں انہیں مزید وضاحت سے لکھ دیا جاتا اور اگر ضمنی بحثوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی واقعی ضرورت ہوتی تو انہیں الگ کر کے شائع کیا جاتا۔

اسی طرح ایک اختلاف ہمیں مصنف سے یہ بھی ہے کہ انہوں نے زیرِ نظر کتاب کی کتابت وطباعت اور تصحیح وغیرہ کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ یہ کتاب کسی وقتی اور ہنگامی مسئلہ پر نہیں لکھی گئی ہے کہ اس کی ضرورت چند سال بعد محسوس نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کا شمار ان کتابوں میں ہے جو علم کی تاریخ میں باقی رہتی ہیں۔ اسی لئے ہم اسکے عمدہ کاغذ پر ایسی کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کئے جانے کے حق میں ہیں۔ موجودہ شکل میں کتاب میں بے شمار غلطیاں نظر آتی ہیں بلکہ صفحہ ۱۹۶ پر درج شدہ فاضل بن علی بن حسن کے خروج کی تفصیل بھی نہیں دی گئی جو شاید عدمِ توجہی کے سبب نظر انداز ہو گئی ہے۔ (خ ۔ م)

---
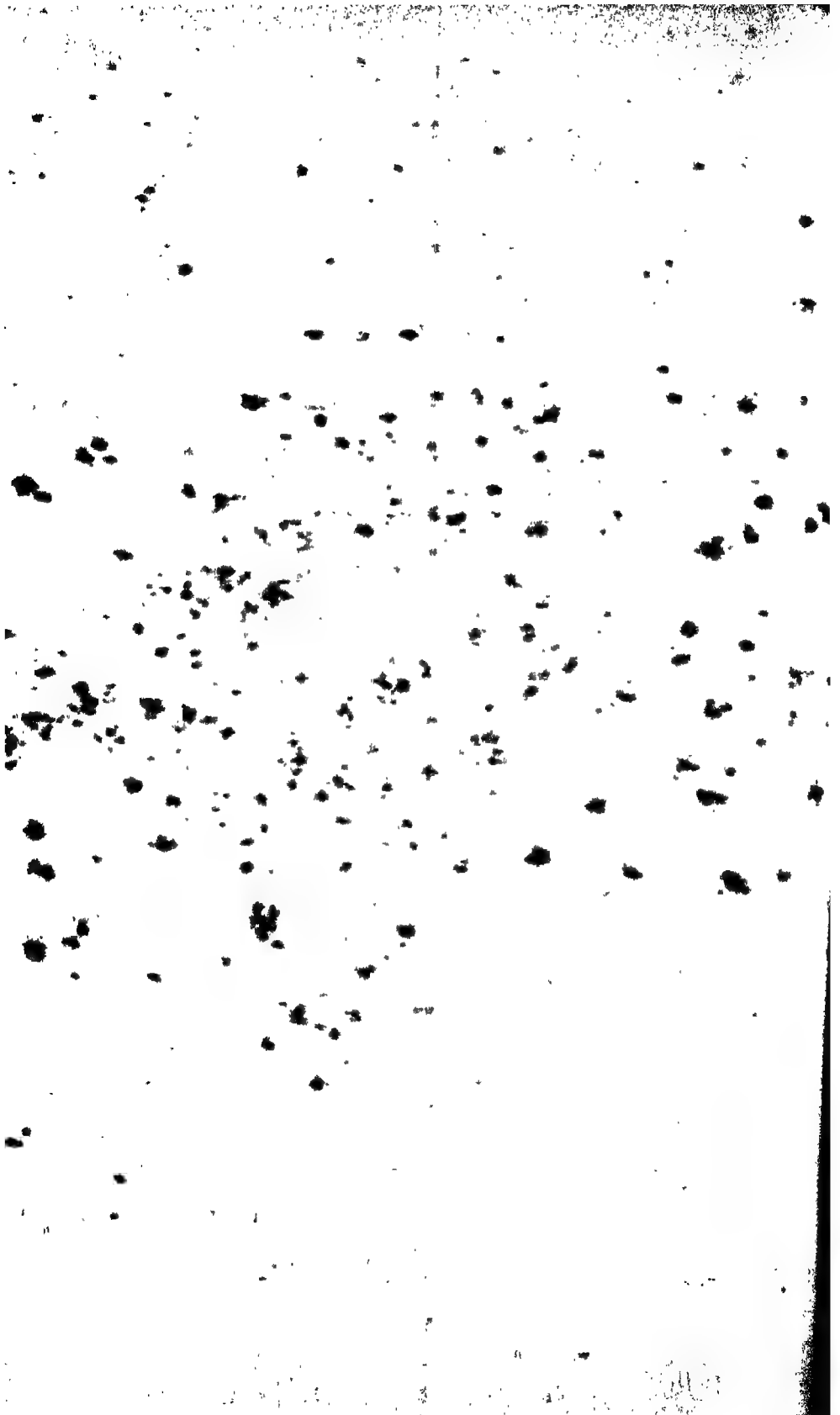
Regd No. L. 7365

Monthly "MEESAAQ" Lahore

MAY, 1962

ماہنامہ

# میثاق

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

ماہنامہ **میثاق** لاہور

جلد ۶ | محرم الحرام ۱۳۸۲ھ | شمارہ ۶

# فہرست مضامین



ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
منیجر ماہنامہ میثاق

ہندوستانی خریداروں کے لئے ترسیل زر کا پتہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افسوس ہے کہ ہماری خواہش اور کوشش کے علی الرغم میثاق کا یہ شمارہ کچھ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مجھے اپنے بعض گھریلو انتظامات کی دیکھ بھال کے لئے پورے دو ہفتے اپنے مستقر سے دور، ایک دیہات میں گزارنے پڑے اور اس دوران میں لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں چند دنوں سے کچھ بیمار ہوں۔ یہ دونوں باتیں مجبوری کی ہیں اس وجہ سے امید ہے کہ رسالہ کے قارئین اس تاخیر کو معاف فرمائیں گے۔ ساتھ ہی ایک گزارش یہ بھی ہے کہ اس شمارے میں تفسیر کی جو قسط دی گئی ہے اس کی بعض بحثوں کو میں مزید مدلل کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ پرچہ کی کتابت ہو چکی ہے، نیز مراجعت کتب کے انتظار میں مزید تاخیر کا اندیشہ ہے اس وجہ سے اب اس کام کو کسی آئندہ فرصت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ قارئین اگر کسی بحث میں کوئی خلا محسوس کریں تو اس کی طرف توجہ دلا دیں۔ میں اس کے لئے ممنون ہوں گا اور آئندہ اس خلا کو بھرنے کی کوشش کروں گا۔

(۲)

ہمارے ملک کے انتخابات پر بین الاقوامی شہرت رکھنے والے جریدہ ٹائم TIME کا یہ تبصرہ بڑا معنی خیز ہے۔

چونکہ مغربی طرز کی سیاسی تنظیمات کے مقابلہ میں یہاں ووٹروں کی تعداد بہت کم تھی اس لئے انتخابی سرگرمیوں کے لئے عام طور پر قہوہ خانوں اور امیدواروں کے گھروں ہی کو مرکز بنایا گیا۔

سیاست دانوں کے اس اعلان کے بعد کہ ووٹروں اور ان کے گھر والوں کی ضیافت بھنے ہوئے گوشت اور مصالحہ دار پلاؤ سے کی جائے گی بعض گھروں میں کھانے والوں کا اتنا ہجوم ہو گیا کہ حکومت کو ۲۵ مہمانوں سے زیادہ کی ضیافت پر پابندی سے اغماض برتنا پڑا۔ زیادہ کھاتے پیتے امیدواروں نے تو عالیشان کوٹھیاں اور کرایہ کے خدمت گار اور چوکیدار بھی حاصل کئے تاکہ انتخاب کی تاریخ سے پہلے دوسرے امیدواران کے ووٹروں تک نہ پہنچ سکیں۔"

---

آگے چل کر تبصرہ نگار صاحب لکھتے ہیں۔

"ایوب کی سب سے بڑی فتح رائے دہندوں کا بھاری اکثریت سے ان کٹر مسلمان انتہا پسندوں کو مسترد کر دینا ہے جو معاشرہ کی "تطہیر" اور ایوب خاں کی ان اصلاحات کو ختم کرنے کا دعوے کر اٹھے تھے جن کے ذریعے تعدد ازدواج اور شوہر کی ترنگ پر ایک ہی نشست کے رواجی نظام طلاق پر پابندی لگائی گئی ہے"۔

اس امر میں تو شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انتخابات میں بالعموم ان لوگوں کو ناکامی ہوئی جو مذہب کی نمائندگی کے دعویدار تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے کہ "کٹر مسلمان انتہا پسندوں" کی شکست صدر ایوب کی نافذ کردہ عائلی اصلاحات کے حامیوں کی فتح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ انتخابات میں کامیاب ہوئے ان میں سے شائد ہی کوئی صاحب ایسے ہوں جو عائلی اصلاحات کے حامی کی حیثیت سے اپنے ووٹروں کے سامنے ظاہر ہوئے ہوں بلکہ ان میں سے ہر ایک نے، جہاں تک ہمیں علم ہے ووٹروں سے یہی وعدہ کیا ہے کہ وہ پارلیمنٹ میں پہنچ کر صدر ایوب کی نافذ کردہ اصلاحات کو تبدیل کرانے کی کوشش کریگا۔

---

رہا "کٹر مسلمان انتہا پسندوں" کا معاملہ تو ان کے لئے ہمارا مشورہ وہی ہے جو ہم اس سے پہلے بارہا دے چکے ہیں کہ وہ اگر انتخابات کی راہ سے اقتدار چاہتے ہیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ابھی کچھ عرصہ وہ اپنی بھی اصلاح کریں اور اس معاشرہ کی بھی جس کے اندر وہ زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے کہ ابھی نہ تو ان کے اندر وہ شائستہ صالحیت پیدا ہوئی ہے جو ان کو دوسروں سے

ماز کرنے والی ہو اور نہ اس معاشرے کے اندر وہ نظر پیدا ہوئی ہے جو ان کی صالحیت کو
بیان صالحیت کے اس ہجوم میں پہچان سکے اس کام کیلئے لازماً کچھ عرصہ تک جد و جہد کرنی پڑیگی اور یہ ضروری ہے
یہ جدو جہد حضرات انبیاء علیہم السلام کے طریقہ پر ہو!

---

اگر ان حضرات کو ہمارا یہ مشورہ قبول نہیں ہے بلکہ وہ اسی معاشرہ کے اندر انتخابات
راہ سے اقتدار حاصل کرنے کے آرزومند ہیں تو پھر ہماری ناچیز گزارش یہ ہے کہ وہ صرف
ان اصولوں ہی کی زبانی پر اکتفا نہ کریں جو انہوں نے اسلام کے نام پر کبھی بنائے تھے
ور بڑے اہتمام کے ساتھ جن کی تبلیغ کی تھی بلکہ ان چیزوں کا بھی اہتمام کریں جن کی طرف
ائم کے تبصرہ نگار نے اشارہ کیا ہے۔ مثلاً

— ووٹروں اور ان کے گھر والوں کی ضیافت کے لئے "بھنے ہوئے گوشت اور مصالحہ دار پلاؤ کا"

— ووٹروں کو گھیرنے اور ان کو دوسرے امیدواروں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے کرایہ کے چوکیداروں اور خدمت گاروں کا"

— ووٹوں کے خریدنے کے لئے کافی سرمایہ کا۔ اس لئے کہ ان لوگوں کا خیال غلط ثابت ہو گیا جو یہ کہتے تھے کہ چونکہ ووٹر کم ہیں اس وجہ سے دام زیادہ نہیں چڑھیں گے۔ اس کے برعکس معلوم ہوا کہ جو چیز بازار میں جتنی ہی کم ہو گی اتنی ہی اس کی قیمت زیادہ ہو گی۔

---

اگر ان چیزوں کا اہتمام ہمارے ان دوستوں نے کر لیا تو امید ہے کہ اگلے انتخابات تک ہمارا معاشرہ ان کی پذیرائی کے لئے بھی تیار ہو جائے گا اور عجب نہیں کہ ان کی کھلائی ہوئی دعوتوں کے باب میں ارباب اقتدار اس اغماض سے بھی کام لیں جس کی طرف ٹائم کے تبصرہ نگار نے اشارہ کیا ہے اس لئے کہ اسلامی فقہ کا مشہور اصول ہے الضرورات تبیح المحظورات (ضرورت ممنوعات کو جائز کر دیتی ہے

(باقی برصفحہ ۵۶)

---

تدبرِ قرآن

امین احسن اصلاحی

# تفسیر سورۂ بقرہ

## (۲۶)

### ۵۰ ۔ آگے کا سلسلۂ کلام (۱۲۲ - ۱۴۱)

اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اہل کتاب بالخصوص یہود کے لئے قبولِ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہ پندار تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اس وجہ سے ہدایت ان کی ہدایت اور مذہب ان کا مذہب ہے۔ وہ اپنے دائرہ سے باہر نہ کسی کے لئے نجات کے قائل تھے نہ کسی نبوت و رسالت کا تصور رکھتے تھے۔ نجات اور ہدایت حاصل کرنے کا واحد راستہ ان کے ہاں یہ تھا کہ آدمی یہودی بنے یا نصرانی۔ قرآن نے اوپر مختلف پہلوؤں سے ان کے اس زعم کی تردید فرمائی۔ اب آگے ان کے ان مزعومات کی تردید کے لئے ان کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزندوں کی سرگذشتِ حیات کا وہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کی رسالت کی تائید اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے تمام دعاوی کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں ہی کے مورثِ اعلیٰ اور پیشوائے روحانی تھے۔ اس وجہ سے تاریخ کا یہ حصہ یکساں طور پر سب کے لئے حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ اس سورہ کے آغاز سے بنی اسرائیل اور ضمناً بنی اسمٰعیل کے ساتھ جو بحث شروع ہوئی تھی وہ اس مقام پر پہنچ کر اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی ہے۔

یہاں جو باتیں قرآن نے اس سرگزشت کی روشنی میں واضح کی ہیں ان کی تفصیل تو آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی لیکن ہم خاص خاص اصولی باتوں کی طرف یہاں اشارہ کئے دیتے ہیں تاکہ کلام کا نظم اور تسلسل نگاہ کے سامنے آجائے۔ یہ اصولی باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامت و پیشوائی کا جو منصب اللہ تعالےٰ نے عطا فرمایا تھا وہ ان کو وراثت کے طور پر نہیں ملا تھا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ تھا۔ پہلے اللہ تعالےٰ نے مختلف امتحانوں میں ڈال کر ان کی اطاعت و وفاداری کی اچھی طرح جانچ کی۔ جب وہ اس جانچ میں پورے اترے تب ان کو یہ منصب عطا ہوا۔ اس وجہ سے یہ منصب تمام تر صفات پر مبنی ہے۔ اس کو کوئی تعلق بھی نسب اور خاندان سے نہیں۔ اس وجہ سے ان کی ذریت میں سے بھی وہی لوگ اس منصب کے سزاوار ہوں گے جو ان صفات کے حامل ہوں جو اس منصب کے شایانِ شان ہیں۔ بدعہد اور نافرمان لوگ اس کے حقدار نہیں ہو سکتے۔

۲۔ بیت اللہ کو اللہ تعالےٰ نے تمام ذریت ابراہیم کے لئے مرکز قرار دیا، اس کو قبلہ بنانے کا حکم ہوا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اس کی تولیت سپرد ہوئی۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اس گھر کی تعمیر کے وقت اپنی ذریت میں سے ایک امت مسلمہ برپا کرنے اور ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول مبعوث کرنے کی دعا کی تھی۔

۴۔ یہ پیغمبر اسی دعائے ابراہیمی کے مظہر اور اسی ملت ابراہیمی کے داعی ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ ملتِ ابراہیمی کی پیروی کا دعوے رکھتے ہوئے ان کی دعوت سے گریز اختیار کر رہے ہیں وہ خود اپنے آپ کو بے وقوف ٹھہرا رہے ہیں۔

۵۔ اسی ملتِ اسلام کی وصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اپنی اولاد کو کی اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد نے اسی ملت پر جینے اور اسی ملت پر مرنے کا حضرت یعقوبؑ سے عہد کیا۔

۶۔ ان تمام واقعات و حقائق کا تقاضا یہ ہے کہ اہل کتاب یہودیت یا نصرانیت کے تعصب میں مبتلا ہونے کے بجائے اس ملت ابراہیمی کی پیروی کریں جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔ خدا کے نبیوں کے درمیان کوئی تفریق نہ کریں بلکہ اس دینِ اسلام کو اختیار کریں جو مشترک طور پر تمام نبیوں اور تمام رسولوں کا دین ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں وہ اسلام کے رنگ کو اختیار کریں اور یہی رنگ اللہ کا رنگ ہے نہ کہ یہودیت اور نصرانیت۔ جو لوگ اس رنگ سے الگ کوئی رنگ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ اللہ اور اس کے رسولوں سے الگ اپنی پارٹی بنانے کے درپے ہیں۔

۷۔ یہ دعوےٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور ان کے سلسلہ کے دوسرے انبیاء علیہم السلام یہودی یا نصرانی تھے۔ جو لوگ اس قسم کے دعوے کر رہے ہیں وہ حقیقت پر پردہ ڈال رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان نبیوں کے دین و مذہب سے ان مدّعیوں کے مقابل میں زیادہ باخبر ہے۔

۸۔ آخری بات جو اس سلسلۂ کلام میں بطور ٹیپ کے بند کے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ دو مرتبہ کہی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے جن آباؤ اجداد پر تم تکیہ کئے ہوئے ہو وہ اپنی زندگیاں گزار چکے اور اپنے اعمال اپنے ساتھ لے گئے۔ نہ ان کے کارناموں کا کریڈٹ تم کو ملے گا اور نہ ان کے کسی عمل کے بارے میں تم سے مواخذہ ہونا ہے۔

ان مطالب کو ذہن کے سامنے رکھتے ہوئے اب ان آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۲۲ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۱۲۳ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَـمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ

إِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلٰى إِبْرٰهٖمَ وَإِسْمٰعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ
لِلطَّائِفِينَ وَالْعٰكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿١٢٥﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ
هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ۖ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۖ وَ
بِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٢٦﴾ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ ۖ
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ
لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ۖ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ
أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾ وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرٰهٖمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدِ
اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿١٣٠﴾ إِذْ قَالَ لَهُ
رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿١٣١﴾ وَوَصّٰى بِهَا إِبْرٰهٖمُ
بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ ۖ يٰبَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا
وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٢﴾ أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ ۖ إِذْ
قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي ۖ قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ اٰبَائِكَ
إِبْرٰهٖمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَاحِدًا ۚ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٣﴾
تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ
عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ
مِلَّةَ إِبْرٰهٖمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾ قُولُوا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا
أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلٰى إِبْرٰهٖمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ
وَمَا أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ
أَحَدٍ مِنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٦﴾ فَإِنْ اٰمَنُوا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهِ
فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ ۚ

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ صِبْغَةَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ۝ قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ۝ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ قُلْ أَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُ مِنَ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

اے بنی اسرائیل میرے اس فضل کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور اس بات کو کہ میں نے تمہیں اہلِ عالم پر تفضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی کے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ قبول ہوگا، نہ اس کو کوئی شفاعت نفع پہنچائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد ہی کی جا سکے گی۔

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ اس نے پوری کر دکھائیں، فرمایا، بے شک میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ اس نے پوچھا اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے۔

اور یاد کرو، جب کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مسکنِ ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم اور اسمٰعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع، سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے دعا کی کہ اے رب اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے باشندوں کو، جو ان میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں پھلوں کی روزی عطا فرما، فرمایا جو کفر کریں گے میں انہیں بھی کچھ دن بہرہ مند ہونے کی مہلت دوں گا، پھر میں ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف دھکیلوں گا اور

وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

اور یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے انہوں نے دعا کی کہ اے ہمارے رب ہماری جانب سے یہ دعا قبول فرما۔ بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے۔

اے ہمارے رب ہم دونوں کو تو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری ذریت میں سے تو اپنی ایک فرمانبردار امت اٹھا اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما بے شک تو توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے ہمارے رب تو ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اور کون ہے جو ملت ابراہیم سے اعراض کرسکے۔ مگر وہی جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے، ہم نے اس کو دنیا میں بھی برگزیدہ کیا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرہ میں ہوگا۔ جب کہ اس کے رب نے اس کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو حوالہ کر دے۔ اس نے کہا میں نے اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کے حوالہ کیا۔

اور ابراہیم نے اسی بات کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اسی کی وصیت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کی۔ اے میرے بیٹو، اللہ نے تمہارے لئے دینِ اسلام کو منتخب فرمایا تو تم نہ مرنا مگر اسلام کی حالت پر۔

کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا۔ جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟ وہ بولے کہ ہم تیرے معبود اور تیرے آباؤ اجداد ــــ ابراہیم اسمٰعیل اور اسحٰق ــــ کے معبود کی پرستش کریں گے جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا، اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو کچھ تم نے کمایا، اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بابت تم سے سوال نہیں

ہوگا۔

اور کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے کہو بلکہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو اللہ کی طرف یکسو تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد کی طرف اتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰ وعیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے ملی، ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں۔

اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو پھر وہ درپئے مخالفت ہیں۔ ان کے مقابل میں تمہارے لئے اللہ کافی ہوگا وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

کہہ دو، یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔ کہہ دو، کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کر رہے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا بھی رب ہے، وہی تمہارا بھی رب ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اور ہم خالص اسی کے لئے ہیں۔

کیا تم دعوےٰ کرتے ہو کہ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب اور ان کی ذرّیت کے لوگ یہودی یا نصرانی تھے۔ پوچھو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو جو ان کے پاس ہے چھپائیں۔ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا، اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تم کو ملے گا جو کچھ تم نے کمایا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بابت تم سے سوال نہ ہوگا۔

## ۵۱ - الفاظ اور جملوں کی وضاحت

یٰبَنِیۡٓ اِسۡرَآءِیۡلَ ... وَلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ | یہ دونوں آیتیں معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ اوپر بھی گزر چکی ہیں اور وہاں ہم ان پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ ملاحظہ

ہو تفسیر آیات ۱۲۴ ـ ۱۴۱

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ ..... لَا يَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِيْنَ | ابتلاء کے معنی جانچنے اور امتحان کرنے کے ہیں۔ یہ ابتلاء بندوں کی تربیتِ اخلاقی کے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے۔ اسی چیز سے بندوں کی وہ صلاحیتیں ابھرتی اور نشوونما پاتی ہیں جو ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہیں اور اسی سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہ امتحان نرم اور سخت، سرد اور گرم، خوش کن اور رنجیدہ، حوصلہ افزا اور ہمت آزما دونوں طرح کے حالات کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی اس سے مقصود بندے کو دکھ میں مبتلا کرنا نہیں ہوتا بلکہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا صرف اس کی صلاحیتوں کو ابھارنا اور پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔ آگے اس پر مفصّل بحثیں آئیں گی۔

کلمات کلمہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی مفرد لفظ کے بھی آتے ہیں اور پوری بات کے بھی۔ یہاں کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو اس نے حضرت ابراہیمؑ کی عزیمت و استقامت کے امتحان کے لئے ان کو دیئے اور انہوں نے بے چون وچرا ان کی تعمیل کی۔ مثلاً انہوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں عین اپنی قوم کے بتکدے میں توحید کی اذان دی اور جو بت صدیوں سے معبود بن کر پج رہے تھے ان کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ ان کو دینِ آبائی کی توہین کے جرم میں آگ میں ڈالا گیا، وہ بے خطر اس آگ میں کود پڑے۔ ایک جبار بادشاہ نے ان کو دینِ حق سے پھیرنا چاہا، انہوں نے حجتِ ابراہیمی سے اس کے چھکے چھڑا دیئے۔ ان کو خاندان، جائداد اور قوم و وطن سب کو چھوڑ کر ہجرت کا حکم ہوا۔ وہ سب کو چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔ ان کو دشتِ غربت میں اکلوتے اور محبوب فرزند کی گردن پر چھری چلا دینے کا حکم ہوا۔ انہوں نے بے دریغ اس بازی کیلئے بھی آستینیں چڑھالیں اور سیزدہ سالہ فرزند کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔ حکمِ الٰہی کی تعمیل میں جاں بازی وجاں سپاری کے اس قسم کے عظیم کارناموں سے ان کی زندگی کا ہر ورق نورانی ہے۔ ہم نے صرف چند واقعات کی طرف بطورِ مثال اشارہ کر دیا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام وہدایات کی تعبیر کے لئے کلمات کا جو لفظ استعمال

...رمایا ہے۔ اس میں بلاغت کا ایک خاص نکتہ مضمر ہے۔ وہ یہ کہ لفظ کلمہ ایک قسم کے اجمال
...بہام کا حامل ہے۔ یہ لفظ کلمہ کُن کی طرح ایک واجب التعمیل حکم کو تو مخاطب کے سامنے
...ر دیتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ اس کا فلسفہ، اس کا صلہ اور اس کا انعام بھی بیان
...سوفاداری اور اطاعت کے امتحان کے لئے اس طرح کے احکام سب سے زیادہ سخت ہوتے
...ں۔ اس وجہ سے جو بندہ اس طرح کے امتحان میں بازی لے جاتا ہے اس کا اجر و انعام بھی بہت
...ا ہے۔ مثلاً اللہ تعالےٰ نے خواب میں ایک اشارے کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام
...بیٹے کو ذبح کر دینے کا حکم دے دیا۔ نہ اس کی علت و حکمت واضح فرمائی نہ اس کا اجر و انعام
...ان فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چاہتے تو اس خواب کو صرف ایک خواب کا درجہ بھی دے
...لیتے تھے اور چاہتے تو اس کی کوئی تعبیر بھی نکال سکتے تھے لیکن جس طرح اس کائنات کی
...ر چیز خدا کے کلمۂ کُن کی تعمیل کرتی ہے، اس کو نہ تو اس کے فلسفہ سے بحث ہوتی، نہ اس
...ے اجر و ثواب سے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے ہر کلمہ کی تعمیل
...، نہ اس کا فلسفہ پوچھا، نہ اس کا اجر و ثواب معلوم کیا۔ حکم ہوا آگ میں کود پڑو، کود پڑے۔
...م ہوا قوم و وطن کو چھوڑ دو، چھوڑ دیا۔ حکم ہوا بیٹے کی گردن پر چھری چلا دو، اس کو پچھاڑ
...یا۔ ان امتحانی احکام کی اس مخصوص نوعیت کی وجہ سے قرآن نے ان کو کلمات کے لفظ
...ے تعبیر فرمایا۔

یوں تو ان امتحانات میں سے ہر امتحان نہایت کٹھن تھا لیکن خاص طور پر بیٹے کی
...بانی والا امتحان تو ایک ایسا امتحان تھا جس میں پورا اترنا تو الگ رہا اس کا تصوّر
...ی ایک عظیم امتحان تھا لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں بھی پورے
...ر گئے تو اللہ تعالےٰ نے ان سے یہ وعدہ فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (میں تم کو
...ول کا پیشوا بنانے والا ہوں) یہ ایک ہی وعدہ بیک وقت دو وعدوں پر مشتمل ہے۔ ایک
...اس پر کہ حضرت ابراہیمؑ ان سب کے پیشوا ہوں گے۔ اس عظیم انعام کے مستحق وہ اس
...بب سے قرار پائے کہ انہوں نے اللہ کی خاطر نہ صرف اپنے خاندان اور اپنی قوم کو چھوڑ کر
...یب دشتِ غربت میں اپنے اس اکلوتے فرزند کو بھی قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے جو اس بڑھاپے

اور اس تنہائی میں ان کی تمام تمناؤں کا واحد مرکز تھا۔ تورات میں اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح کے خاص اس حصہ میں یہود نے بہت سی تحریفات کردی ہیں تاہم یہ وعدہ تھوڑے سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۲۲۔

اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کردونگا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔

اس وعدے کے ایفاء میں اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ دونوں کی نسل سے عظیم قومیں پیدا کیں جن کے مورثِ اعلیٰ اور روحانی پیشوا بلا اختلاف حضرت ابراہیمؑ تھے۔ پھر ان کے اندر نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری ہوا۔ ان میں جلیل القدر بادشاہ پیدا ہوگئے جو دشمنوں کے پھاٹکوں کے فاتح بنے۔ پھر انہی کی ایک شاخ میں پیغمبر خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت ہوئی جن کے واسطہ سے تمام دنیا کو ایمان و ہدایت کی برکت نصیب ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تو انہوں نے سوال کیا کہ امامت و پیشوائی کا یہ عہد انہی کے ساتھ خاص ہے یا ان کی ذریت بھی اس میں شامل ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے) ظالم سے مراد قرآن میں صرف وہی لوگ نہیں ہوتے جو دوسروں پر ظلم ڈھانے والے ہوں بلکہ اس سے بیشتر وہ لوگ مراد لئے گئے ہیں جو شرک و کفر میں مبتلا ہو کر خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں مثلاً۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ (پس ان میں کتنے اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے اور کتنے میانہ رو ہیں) فاطر ۳۲۔ وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ (اور ان دونوں کی ذریت میں ٹھیک عمل کرنے والے بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلا ہوا ظلم کرنے والے بھی) ۱۱۳۔ صافات۔

مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ تمہاری ذریت میں سے تمہاری روش پر قائم اور میری دی ہوئی شریعت وہدایت پر استوار رہیں گے وہ تو تمہارے بعد اس امامت کے وارث ہوں گے۔ لیکن جو بدعہدی اور نافرمانی کر کے شیطان کی راہ پر چل پڑیں گے وہ اس امامت میں سے کوئی حصہ نہیں پائیں گے۔

یہ تصریح یہاں اس لئے کی گئی ہے تاکہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ان کو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت ہونے پر جو ناز ہے اور جس کے سبب سے وہ ایمان اور عمل کی تمام ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو سبکدوش سمجھے بیٹھے ہیں، یہ بالکل غلط ہے۔ ابراہیمؑ کی وراثت میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو شرک وکفر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اسی روز واضح کر دی تھی جس روز ان کو اس منصبِ امامت پر سرفراز فرمایا تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ اوپر ہم نے تورات کا جو حوالہ نقل کیا ہے اس میں یہ تصریح بھی ضرور موجود رہی ہوگی لیکن چونکہ یہ بات یہود کے منشاء کے خلاف تھی اس وجہ سے انہوں نے جس طرح اس سلسلہ کے واقعات میں دوسری بہت سی تبدیلیاں کر دیں۔ اسی طرح اپنی خواہش کے خلاف پا کر اس تصریح کو بھی انھوں نے حذف کر دیا۔ استاذ امامؒ نے اپنے رسالہ ذبیح میں ان تحریفات سے پردہ اٹھایا ہے۔ تفصیل کے طالب اس رسالہ کو ضرور پڑھیں۔

<u>وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ ...... وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ</u> بیت سے مراد بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ ہے۔ قرآن مجید میں اس شکل میں یہ لفظ خانہ کعبہ ہی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش باب ۱۲ میں اس کو بیت ایل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایل عبرانی میں اللہ کو کہتے ہیں۔

مثابۃ کے معنی مرکز و مرجع کے ہیں، جس کی طرف سب رجوع کریں، جس کے ساتھ سب وابستہ ہوں، جو سب کا مرکز اور سب کا قبلہ ہو۔

للناس سے یہاں مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر انی جاعلك للناس اماما میں ہوا ہے یعنی وہ تمام ذریت ابراہیمؑ جس کی امامت و پیشوائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو

حاصل ہوئی عام اس سے کہ وہ حضرت اسحٰق کی نسل سے ہوں یا حضرت اسمٰعیلؑ کے سلسلہ سے ہوں، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی تمام ذرّیت کا پیشوا بنانے کا فیصلہ کیا گیا اسی طرح یہ فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ خدا کی عبادت کے لئے جو گھر وہ بنائیں گے وہ تمام ذریت ابراہیمؑ کا مرکز اور قبلہ ہوگا اور پھر ذریت اسمٰعیل علیہ السلام کے واسطہ سے، جیساکہ آگے ذکر آرہا ہے، تمام دنیا کی قومیں اس گھر کی برکتوں میں سے حصّہ پائیں گی۔

استاذ امام مولانا فراہیؒ اس مسئلہ میں نئی تحقیق یہ بیان فرماتے ہیں۔

"تورات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو شروع ہی سے یہ حکم ملا تھا کہ وہ اپنی بڑی قربانیوں کا قبلہ مکہ معظمہ کی سمت کو قرار دیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قربانی کے لئے ضروری تھا کہ وہ معبد میں خداوند کے حضور پیش کی جائے۔ فصل دوم حرف ی میں ہم بتا چکے ہیں کہ جس قربانی کا نام ان کے ہاں قدس اللہ قداس تھا اس کا رخ جنوب کی سمت ہونا ضروری تھا۔ اسی طرح سالانہ قربانی جو ان کے ہاں سب سے بڑی قربانی خیال کی جاتی تھی اس کا رخ بھی جانب جنوب ہی ہوتا۔ یہود یا تو اس معاملہ کے اصلی راز سے بے خبر تھے جیساکہ فصل دوم حرف ی میں ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں یا انہوں نے بالقصد اس معاملہ کو کریدنا نہیں چاہا۔ بلکہ اپنی عادت کے مطابق چاہا کہ اس پر پردہ ہی پڑا رہے

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

حالانکہ یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہے کہ ان کے خیمہ عبادت کا رخ ابتداء سے جانب شمال تھا دیکھو سفر خروج ۲۷ : ۹

"مسکن کا گھر جنوب کی جانب برکت حاصل کرنے کے رخ پر بنایا جائے۔ نیز اسی سفر خروج کے باب ۴۰ آیت ۲۱-۲۴ میں ہے

اور میز کو اس پردے کے باہر مسکن کی شمالی سمت میں خیمۂ اجتماع کے اندر رکھا اور اسی پر خداوند کے حضور روٹی سجا کر رکھی جیساکہ خداوند نے موسیٰ کو حکم کیا تھا اور خیمۂ اجتماع کے اندر ہی میز کے سامنے مسکن کی

جنوبی سمت میں شمعدان رکھا۔"

ہمارے نزدیک اس ساری ترتیب کا اصلی فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص خداوند کے حضور آئے اس کا رخ جانب جنوب یعنی مکہ معظمہ اور ابراہیمی قربان گاہ کی طرف ہو۔ اس کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ خیمہ کے اندر مسکن مقدس بھی جنوب ہی کی سمت میں تھا اور مذبح اس کے سامنے دروازے کی طرف تھا۔ اس لئے جو شخص وہ قربانی پیش کرتا جس کو قدس الاقداس کہتے ہیں وہ مذبح کے شمالی جانب کھڑا ہوتا تاکہ اس کا رخ مسکنِ ربانی کی طرف ہو سکے جس کے معنی یہ تھے کہ اس کا رخ لازماً خانہ کعبہ کی طرف ہوتا جس کے پاس ہی مروہ ہے جس کو اولین قربان گاہ ہونے کی عزت حاصل ہے اور اس کے پاس ہی مسکن اسمٰعیل بھی ہے۔"

(ملاحظہ ہو رسالہ ذبیح فصل ۱۵)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ جس طرح ہماری نمازوں اور قربانیوں کا قبلہ خانہ کعبہ ہے اسی طرح ابتدا ہی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام ذریت کی عبادت و قربانی کا قبلہ بھی خانہ کعبہ ہی کو قرار دینے کا فیصلہ ہوا تھا۔ چنانچہ اسی رخ پر ان کا خیمہ عبادت بھی تھا اور پھر بعد میں اسی رخ پر بیت المقدس کی بھی تعمیر ہوئی لیکن یہود نے محض تعصب کی وجہ سے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

آگے اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں۔

"ہمارے مذکورہ دعاوی کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے مسکن کو تمام ذریت ابراہیمؑ کا قبلہ قرار دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو عرب کے مشرق اور شمال میں آباد کیا اور ان کا قبلہ حضرت اسمٰعیلؑ کے مسکن کو قرار دیا۔ چنانچہ تورات سے ثابت ہے کہ ان کو ان کے تمام بھائیوں کے آگے بسایا۔ پیدائش ۲۵-۱۸ میں ہے۔

"اور اس کی اولاد حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے

جس سے اسور کو جاتے ہیں، آباد تھی۔ یہ لوگ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسے ہوئے تھے۔"

اور پیدائش ۱۶: ۱۲ میں ہے۔

"وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہوگا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا۔"

"سب بھائیوں کے سامنے بسنے" کی جو تاویل ہم نے کی ہے، اس کے سوا اس کی کوئی دوسری صحیح تاویل ممکن نہیں ہے کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد ماسوا بنی اسمٰعیل کے مشرق و شمال میں آباد ہوئی۔ پس حضرت اسمٰعیل ان سب کے سامنے اسی وقت ہو سکتے ہیں جب یہ مانا جائے کہ ان کی بستی ان سب کے قبلہ کے سمت میں تھی۔ ہمارے نزدیک اس بات کو ماننے میں کسی تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ یہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالےٰ نے سب کا امام بنایا تھا اور ان کے بعد اس امامت کے وارث حضرت اسمٰعیل ہوئے۔ قرآن مجید نے اس معاملہ کی طرف بعض اشارات کئے ہیں[1]۔ (آگے مولاناؒ نے وہی آیت نقل فرمائی ہے جو یہاں زیر بحث ہے)

وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (اور مسکن ابراہیمؑ کے ایک حصہ میں نماز کی ایک جگہ بنا لو) یہ ٹکڑا اوپر والے ٹکڑے ہی کی مزید وضاحت ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ "ہم نے ابراہیم نے حکم دیا" کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں جملوں میں ایک ہی بات دو مختلف پہلوؤں سے کہی گئی ہے۔ پہلے یہ فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے بیت اللہ کو تمام اولادِ ابراہیمؑ کے مرکز و قبلہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ پھر یہ فرمایا کہ اسی فیصلہ کو بروئے کار لانے کے لئے ابراہیمؑ اولادِ ابراہیمؑ کو یہ حکم ہوا کہ مسکن ابراہیمؑ کے ایک حصہ میں نماز کی ایک جگہ بناؤ۔

یہاں آیت میں مقامِ ابراہیم کا لفظ آیا ہے۔ مقام سے کیا مراد ہے؟ علمائے تفسیر سے

[1] دیکھئے مولانا فراہیؒ کا رسالہ ذبیح فصل ۱۲

اس بارے میں دو قول منقول ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اس سے مراد وہ پتھر ہے جس کے
متعلق یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ دوسرے گروہ
کے نزدیک اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے۔ اس گروہ نے مقام کے لفظ کو کسی مخصوص کھڑے
ہونے کی جگہ کے بجائے مسکن و مستقر کے مفہوم میں لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے
اس تاویل میں وسعت و جامعیت کے ساتھ ساتھ خاص اہمیت رکھنے والا پہلو یہ ہے کہ نظم کلام کے
اعتبار سے یہ اس مقصد کو زیادہ واضح کرنے والی ہے جس کے لئے یہ بات یہاں کہی گئی ہے
یہاں یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہی گھر تمام اولاد ابراہیمؑ کا قبلہ رہا ہے اس لئے کہ یہی گھر ہے
جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے اپنے اس مستقر میں تعمیر کیا
جس میں ہجرت کے بعد انہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ سکونت اختیار کی۔

یہ مسئلہ ہمارے اور یہود کے درمیان ایک بڑا نزاعی مسئلہ ہے۔ یہود نے خانہ کعبہ اور حرم
کی قربان گاہ سے حضرت ابراہیمؑ کا تعلق بالکل کاٹ دینے کے لئے واقعہ قربانی میں بھی اور ان کی
سرگذشت ہجرت میں بھی نہایت بھونڈی قسم کی تحریفات کر دی ہیں اور اس طرح انہوں نے یہ
ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس بیٹے کی قربانی کی وہ حضرت
اسحاق علیہ السلام ہیں نہ کہ حضرت اسمٰعیل، جس جگہ قربانی کی وہ جبل یروشلم ہے نہ کہ مروہ، نیز
عبادت کے لئے انہوں نے جو گھر بنایا وہ بیت المقدس ہے نہ کہ بیت اللہ۔ انہوں نے جس
جگہ ہجرت کے بعد سکونت اختیار کی وہ کنعان ہے نہ کہ جوارِ خانہ کعبہ۔ ان بیانات کی تصدیق یا
تردید کا واحد ذریعہ چونکہ تورات ہی ہے اور تورات میں یہود نے اپنے حسبِ منشاء جیسا کہ ہم نے
عرض کیا تحریف کر ڈالی، اس وجہ سے اصل حقائق سے پردہ اٹھانا بڑا مشکل کام تھا لیکن ہمارے
استاذ مولانا فراہیؒ نے یہود کی ان تمام تحریفات کا پردہ خود تورات ہی کے دلائل سے اپنے
رسالہ ذبیح میں بالکل چاک کر کے رکھ دیا ہے۔ انہوں نے تورات ہی کے بیانات سے ثابت
کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وطن سے نکلنے کے بعد حضرت اسحاقؑ کی والدہ کو تو کنعان میں

---

[1] واضح رہے کہ اس گروہ میں ابن عباس، مجاہد اور عطا جیسے اکابر علم تفسیر شامل ہیں۔

چھوڑا اور خود حضرت اسمٰعیل اور ان کی اولاد کے ساتھ بیر سبع کے بیابان میں قیام کیا۔ یہ جگہ ایک غیر آباد جگہ تھی اس وجہ سے انھوں نے یہاں سات کنوئیں کھودے اور درخت لگائے۔ یہیں ان کو خواب میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم صادر ہوا اور وہ حضرت اسمٰعیل کو لے کر مروہ کی پہاڑی کے پاس آئے اور اس حکم کی تعمیل کی۔ اسی پہاڑی کے پاس بیت اللہ کی تعمیر ہوئی اور اسی کے پاس انہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کو آباد کیا۔ پھر یہاں سے لوٹ کر وہ بیر سبع گئے اور اپنے قیام کے لئے ایسی جگہ منتخب کی جو خانہ کعبہ سے قریب بھی ہو اور جہاں سے وقتاً فوقتاً حضرت اسحاقؑ کو دیکھنے کے لئے بھی جانا آسانی سے ممکن ہو سکے۔

مولاناؒ نے یہ ساری باتیں تورات کے نہایت ناقابلِ تردید دلائل سے ثابت کر دی ہیں۔ ہر سوال پر اصل کتاب کے اقتباسات پیش کرنے میں طوالت ہے اس وجہ سے ہم نے صرف خلاصۂ بحث اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ جو لوگ تفصیل کے طالب ہوں وہ مولاناؒ کے مذکو[ر] رسالہ کا مطالعہ کریں۔

ظاہر ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے قیام اسی علاقہ میں فرمایا نہ کہ شام میں تو ان کو نماز کے لئے ایک مرکز کی تعمیر بھی اسی علاقہ میں کرنے کا حکم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں انہوں نے اس بیت اللہ کی تعمیر کی جس کا ذکر تورات کی کتاب پیدائش میں بیت ایل کے نام سے ہوا ہے۔ بیت اللہ اور بیتِ ایل دونوں کے معنی بالکل ایک ہیں۔ ایل کے معنی عبرانی میں اللہ کے ہیں۔ اس بیت ایل سے اگر یہود بیت المقدس کو مراد لیتے ہیں تو قطع نظر اس سے کہ اس سرزمین کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا مسکن نہیں بنایا یہود کے اس دعوے کو جھٹلانے والی سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر بالاتفاق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سیکڑوں سال بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں ہوئی ہے۔ چنانچہ خانہ کعبہ کی اسی قدامت اور اولیت کی وجہ سے قرآن نے اس کو "بیت عتیق" اور "اول بیت" کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ فِیْہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا (۹۷-آل عمران) (بے شک پہلا گھر جو لوگوں — اولاد ابراہیمؑ — کے لئے تعمیر ہوا وہی ہے جو بکہ میں ہے۔ مبارک اور تمام

[illegible]

عالم کے لئے سرچشمۂ ہدایت۔ اس میں (اس کی اولیت کی) نہایت واضح نشانیاں ہیں، یہ مسکن ابراہیمؑ ہے (اور اس کی روایت ہے کہ) جو اس میں داخل ہوا وہ مامون ہوا)

یہاں بیت اللہ کو مصلیٰ کے لفظ سے جو تعبیر فرمایا ہے تو اس سے اس گھر کے اصل مقصد تعمیر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ نماز کا مرکز ہوگا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کے جوار میں حضرت اسمٰعیل کو بساتے وقت دعا بھی یہی کی تھی کہ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ (اے رب میں نے ان کو اس لئے یہاں بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں) لیکن دورِ جاہلیت میں اس کے مشرک اور متبدع متولیوں نے اس کو بدعات کا ایک اڈہ بنا لیا اور ان کی نماز پھونک مارنے اور تالی بجانے کی ایک بت پرستانہ رسم بن کر رہ گئی۔ اس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں مصلیٰ کے لفظ میں ایک اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ذریتِ ابراہیمؑ کی دونوں شاخوں نے اپنے قبلہ کے بنیادی مقصد کو ضائع کر دیا[1] اور اب خدا نے اپنے اس نبی کو بھیجا ہے جو اس کے اصل مقصد کی تجدید کر رہا ہے۔

وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ الآية۔ عَهِد جب اِلیٰ کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی پر کوئی ذمہ داری ڈالنے یا اس کو کسی شرط کا پابند کرنے کے آتے ہیں مثلاً وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (۱۱۵۔ طٰہٰ) (اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک شرط کا پابند کیا تو وہ بھول بیٹھا اور ہم نے اس میں ارادہ کی مضبوطی نہیں پائی) أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ

---

(بقیہ حاشیہ از صفحہ ۲۰) تحریف کر کے اس کو وادی بکا کر دیا ہے۔ متعلق آیت کی تفسیر کے تحت ہم اس تحریف پر بحث کریں گے (حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] یہ ملحوظ رہے کہ یہود نے جس طرح اپنے دینی لٹریچر سے خانہ کعبہ کے ذکر کو خارج کر دیا اسی طرح نماز کو بھی انہوں نے بالکل خارج کر دیا۔ ان کے ہاں اگر کوئی چیز ہے تو قربانی ہے۔ ان کے معبد کی اصل حیثیت مرکزِ نماز کی نہیں بلکہ قربان گاہ کی ہے۔ ہمیں کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے نماز کی سنت سے محروم ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ انھوں نے اپنے اصل قبلہ خانہ کعبہ سے اپنا تعلق توڑ لیا۔

يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ (۶۰ - یٰس) (کیا میں نے تم کو اس شرط کا پابند نہیں کیا
اے آدم کے بیٹو، کہ تم شیطان کی بندگی نہ کرو گے) پس عَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ کا
یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر خانہ کعبہ کی تولیت کی ذمہ داری ڈالی اور ان کو اس شرط کا پابند
کہ وہ اس گھر کو طواف، اعتکاف اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک صاف رکھیں
پاک صاف رکھنے سے مقصد ظاہر ہے کہ ان ساری چیزوں سے پاک صاف رکھنے
ہیں جو اس گھر کے مقصد تعمیر کے منافی ہوں عام اس سے کہ وہ گندگی و نجاست ہو جس سے عباد
کی طبیعت میں تکدر پیدا ہو، یا ارباب لہو و لعب کے ہنگامے ہوں جن سے ان کی یکسوئی میں خلل
ہو یا اصنام و اوثان ہوں جو خدا کے گھر کو شرک و بت پرستی کا گڑھ بنا کے رکھ دیں۔ ان سار
سے اس گھر کو پاک رکھنے کی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ پہ ذمہ داری ڈال دی گئی تھ
تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے اس ذمہ داری کا حق ادا کیا لیکن بعد میں ان کی اولاد جب شر
بت پرستی میں مبتلا ہو گئی تو اس نے اس گھر کی تولیت کی اس شرط کے برعکس اس کے
کونے میں بتوں کو لا بٹھایا اور ان لوگوں کو اس گھر سے نہایت ظلم اور بے دردی سے
جو اس کو از سر نو ذکر الٰہی کے زمزموں، طواف و اعتکاف کی رونقوں اور رکوع و سجود ک
سے آباد و معمور کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے یہاں خانہ کعبہ کی ابتدائی تاریخ کی اس حقیقت
اسی لئے اشارہ فرمایا ہے کہ قریش اس گھر سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں لیکن جب
نے ان کو سمجھنے سے انکار کر دیا تو بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس کی تولیت کے منصب سے
معزولی کا اعلان کر دیا۔ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَ
بِالْكُفْرِ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ۝ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِ
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ (
(مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے منتظم بنے رہیں۔ درآنحالیکہ و
کفر پر گواہ ہیں، یہی لوگ ہیں جن کے تمام اعمال اکارت گئے اور دوزخ میں ہمیشہ رہنے
یہی ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کے منتظم تو وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان
نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں)

یہاں اس گھر کو تین چیزوں کے لئے خاص کرنے کا حکم ہوا ہے۔ طواف، اعتکاف
رکوع و سجود۔

طواف سے مراد خانہ کعبہ کے ارد گرد پھیرے لگانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت
کا وہ طریقہ واضح فرمایا ہے جو اس کا اصل ابراہیمی طریقہ ہے۔ طواف درحقیقت نماز کی
قسم ہے لیکن یہ نماز صرف خانہ کعبہ ہی کے پاس ادا ہو سکتی ہے اس کے سوا کہیں اور ادا
ہو سکتی۔ اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے اس کا ذکر سب سے پہلے فرمایا۔ وقار و ادب
حدود کے اندر رہتے ہوئے محبت الٰہی کے جذبات جس حد تک اس نماز میں ابھرتے ہیں
اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ شمع و پروانہ کی حکایت طواف میں ایک حقیقت بن جاتی ہے
بشرطیکہ آدمی کے اندر حیاتِ ایمانی کی رمق ہو۔

عاکف، عکوف سے ہے جس کی اصل روح دوسری چیزوں سے صرف نظر کر کے کسی
چیز کو پکڑ لینا ہے۔ اسی سے اعتکاف ہے جو دھیان گیان اور ذکر و فکر کی عبادت ہے۔
ہر چیز سے کٹ کر اپنے رب کی یاد کے لئے گوشہ نشین ہو جائے یہ اعتکاف ہے۔ اس
شکل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت سے واضح فرما دی ہے۔ جس طرح طواف
الٰہی کے جذبات ابھارنے کے لئے اپنے اندر ایک خاص صفت رکھتا ہے اسی طرح
ذکر الٰہی پر عقل اور دل کو جمانے کے لئے اپنے اندر ایک خاص صفت رکھتا ہے۔

رکع راکع کی جمع ہے اور سجود ساجد کی۔ رکوع اور سجدہ کی لغوی تحقیق آیات ۴۳ و ۴۲
کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ یہاں یہ دونوں لفظ نماز کی تعبیر کے لئے وارد ہوئے ہیں۔
تعبیر رکوع اور سجود سے دو اہم حقیقتوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ دونوں
نماز کے قدیم ترین اور اہم ترین ارکان میں سے ہیں۔ نماز کی ظاہری ہیئت میں جو
بھی واقع ہوئی ہوں لیکن یہ دونوں چیزیں جس طرح ہماری نمازوں میں شامل ہیں
ابراہیمی نمازمیں بھی شامل تھیں۔ دوسری یہ کہ نماز سے صرف ذکر و فکر ہی مطلوب
بلکہ اس کی مخصوص صورت و ہیئت بھی مطلوب ہے اور اس کی صورت و ہیئت
اس کے رکوع و سجدہ ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ ....... وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ | رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (اے میرے رب اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے ساکنوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما) آمن کے معنی مامون و مطمئن کے ہیں۔ یہ دعا حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین کے لئے فرمائی ہے جس پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو بسایا اور جہاں حرم کی تعمیر کی۔ یہ علاقہ جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔ تہذیب و تمدن اور آبادی و زرخیزی سے بالکل محروم تھا۔ خانہ بدوش قبائل پانی اور چراگاہوں کی تلاش میں موسموں کے تغیر کے ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر منتقل ہوتے رہتے تھے۔ معاش کا ذریعہ یا تو گلہ بانی تھا یا شکار یا پھر لوٹ مار۔ اس وجہ سے اس سرزمین کے دو مسئلے خاص طور پر حضرت ابراہیم کے زمانے میں بڑے اہم تھے ایک امن کا دوسرا غذا کا۔

حضرت ابراہیمؑ کی مذکورہ دعا انہی دو چیزوں کے لئے تھی۔ اللہ تعالےٰ نے یہ دعا جس طرح قبول فرمائی اور اس کی جو برکتیں حضرت ابراہیمؑ کی ذریت اور اس علاقہ کے باشندوں کیلئے ظاہر ہوئیں وہ تاریخ کی ایک ایسی زندہ اور محسوس حقیقت ہے کہ کوئی کٹر سے کٹر مخالف بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ پھر عجیب ایمان پرور ماجرا یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالےٰ نے بیت اللہ کے واسطہ ہی سے لوگوں کو بخشیں۔ اس دروازے کے سوا انہیں کسی اور واسطہ اور ذریعہ کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ قرآن میں اس گھر کو جو مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا گیا ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

اب آیئے دیکھئے کہ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا اس سرزمین کے بسنے والوں کے لئے کن کن شکلوں میں پوری ہوئی۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے نہ صرف بیت اللہ کو بلکہ اس سرزمین کو بھی جہاں بیت اللہ واقع ہے محترم قرار دے دیا۔ اس میں لڑنا بھڑنا، کسی پر حملہ کرنا، کسی کو قتل کرنا، سب یک قلم ممنوع ہو گیا، جو شخص بھی اس میں داخل ہو گیا وہ خدا کی امان میں داخل ہو گیا۔ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں رہا کہ اس سے کسی قسم کا تعرض کر سکے۔ اس کے حدود سے باہر خطرہ ہی خطرہ تھا لیکن اس کے اندر ربِ ابراہیمؑ نے امن ہی امن پیدا کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کے دائرہ میں کسی جانور کو بھی کوئی اذیت پہنچانا حرام ٹھہرا۔ اپنے اسی احسان کا ذکر اللہ تعالےٰ

نے قریش کو مخاطب کر کے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (۶۷-عنکبوت) (کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے ایک محفوظ حرم بنا دیا درآنحالیکہ ان کے گردوپیش کا حال یہ ہے کہ لوگ دن دہاڑے اچک لئے جاتے ہیں)

دوسری یہ کہ اس گھر کے حج و زیارت کیلئے سال کے چار مہینے بھی محترم قرار دے دیئے گئے۔ ان مہینوں میں لڑنا بھڑنا اور خونریزی و فساد بالکل ممنوع ہو گیا۔ وحشی سے وحشی لوگ بھی ان کے احترام میں اپنی تلواریں میانوں میں کر لیتے تھے اور خطرناک سے خطرناک علاقے بھی بالکل پُرامن ہو جاتے تھے تاکہ لوگ ملک کے ہر گوشے اور کونے سے حج و عمرہ کے لئے آسکیں اور پھر امن و سلامتی کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹ سکیں۔

تیسری یہ کہ اللہ تعالے نے اس گھر کو بیرونی دشمنوں کے خطرات سے بھی بالکل مامون و محفوظ بنایا۔ اس گھر کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ بیرونی دشمنوں کو اوّل تو اس پر حملہ آور ہونے کی کبھی جرأت ہی نہیں ہوئی اور اگر کبھی کسی نے یہ جسارت کی ہے تو اللہ تعالے نے اس کو اپنی قدرتِ قاہرہ سے نہایت عبرتناک سزا بھی دی ہے۔ ابرہہ کی فوجوں کا جو حشر ہُوا وہ تاریخ کی بھی ایک مشہور حقیقت ہے اور اس کا ذکر قرآن کی سورۂ فیل میں بھی ہوا ہے۔

اسی طرح اس گھر کی برکت نے اس سرزمین کے ساکنوں کے لئے معاشی فراغت کے دروازے بھی کھول دیئے۔ اس کے بھی بعض پہلوؤں کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ مرکزِ حج قرار پا جانے کی وجہ سے اس سرزمین کی طرف لوگوں کا رجوع بہت بڑھ گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت جتنی ہی پھیلتی گئی اسی حساب سے لوگ گوشہ گوشہ سے حج و زیارت کے لئے آنے لگے۔ اور پھر اسی اعتبار سے، قدرتی طور پر تجارت اور کاروبار کو فروغ ہُوا۔ باہر سے ہر قسم کی چیزیں مکہ کے بازار میں پہنچنے لگیں اور یہاں سے جو چیزیں باہر جا سکتی تھیں وہ باہر نکلنے لگیں۔ اس گھر کی تعمیر سے پہلے اس علاقہ میں معاش کا تمام تر انحصار جیسا کہ ہم نے ذکر کیا یا تو گلہ بانی اور شکار پر تھا یا لوٹ مار پر لیکن اب تجارت کی راہ کھل جانے کی وجہ سے ہر قسم کی اجناس اور پھل اور ضرورت کی دوسری چیزوں کی فراوانی ہو گئی جس سے لوگ

حیثیت میں ایک نہایت خوشگوار تبدیلی آگئی۔

دوسرا یہ کہ خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو وقار و احترام کا ایک ایسا مقام حاصل ہو گیا کہ تمام عرب پر ان کی سیاسی اور مذہبی دھاک بیٹھ گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے تجارتی قافلے شام اور یمن وغیرہ تک برابر جاتے اور کوئی ان سے مزاحمت کی جرأت نہ کرتا۔ بلکہ تاریخوں سے یہاں تک پتہ چلتا ہے کہ ان کے قافلے جن شاہراہوں سے گزرتے ان پر بسنے والے قبائل ان سے تعرض کرنے کے بجائے اپنے اپنے حدود کے اندر ان کی حفاظت اور رہنمائی کے لئے بدرقہ فراہم کرتے۔ سورۂ لایلاف میں قرآن مجید نے قریش کے انہی تجارتی سفروں کا حوالہ دے کر ان سے مطالبہ کیا ہے۔ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ (پس چاہیئے کہ اس گھر کے رب کی وہ بندگی کریں جس نے ان کو بھوک میں کھلایا اور خطرہ سے نچنت کیا) اس لئے کہ فی الواقع یہ اسی گھر کی برکت تھی کہ وہ ایک پرخطر اور چٹیل بیابان میں امن سے بھی بہرہ مند ہوتے اور ان کے لئے معاش کی راہیں بھی فراخ ہو گئیں۔

بحث کے یہ سارے پہلو تو بالکل واضح ہیں البتہ یہاں ایک بات ایسی ہے جو ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہنوں میں کھٹکے وہ یہ کہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لئے رزق کے لئے جو دعا کی ہے وہ مخصوص طور پر پھلوں کے رزق کی دعا ہے۔ اپنی اولاد کے لئے رزق و فضل کی دعا کرنا بالخصوص جب کہ وہ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بسائی جا رہی ہو ایک بالکل فطری چیز ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس رزق کے لئے پھلوں کی شرط کیوں لگائی۔ ذوق تو یہ کہتا ہے کہ انہیں رزق کی ایک جامع دعا مانگ کر یہ معاملہ اپنے رب پر چھوڑنا تھا کہ رزق وہ انہیں کس شکل میں دے، اپنی طرف سے کسی خاص نوعیت کے رزق کی تجویز پیش کرنا ایک پیغمبر کے لئے کچھ موزوں نظر نہیں آتا۔ قرآن مجید میں دوسرے انبیاء کی یا خود حضرت ابراہیمؑ کی دوسری دعائیں جو مذکور ہیں ان پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی تخصیص و تعیین سے جو ایک تجویز کی سی شکل اختیار کر لے ان میں بالعموم احتراز کیا گیا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ کھٹک محض اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ثمرات سے مراد صرف میوہ جات ہیں حالانکہ ثمرات کے معنی صرف میوہ جات کے نہیں آتے۔ بلکہ میوہ جات کے ساتھ ساتھ اجناس اور غلہ جات بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ میوہ جات کے کے لئے مخصوص لفظ عربی میں فواکہ کا ہے۔ ثمرات کا لفظ اس سے عام اور وسیع ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اسی ابراہیمی دعا کی برکتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ثمرات کل شیئ (ہر چیز کے پھل) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ (۵۷۔ قصص) (کیا ہم نے ایک مامون حرم میں ان کے قدم نہیں جمائے جہاں ہر چیز کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں)

ہم اوپر یہ ذکر کر چکے ہیں کہ یہ سرزمین جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمعیلؑ کو بسایا ایک چٹیل اور غیر آباد جگہ تھی۔ تورات میں اس کے لئے بیابان کا لفظ استعمال ہوا ہے اور خود حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں اس کو وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی وادی) سے تعبیر کیا ہے۔ تورات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمعیلؑ کی بسر اوقات گلہ بانی اور شکار پر تھی جس کے سبب سے انکا زیادہ تر وقت باہر بسر ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب معاش کا انحصار گلہ بانی اور شکار پر ہو تو وہ پرسکون اور برقرار زندگی وجود میں نہیں آسکتی تھی جو بیت اللہ کی تولیت کے فرائض اور اس مشن کی تکمیل کے لئے ضروری تھی جو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمعیلؑ کے سپرد فرمایا تھا۔ اس وجہ سے حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لئے یہ دعا کی کہ ان کو بدویانہ زندگی کی بے اطمینانیوں اور پریشانیوں کی جگہ حضری زندگی کا سکون واطمینان نصیب ہو تاکہ وہ توحید اور عبادتِ الٰہی کے اس عالم گیر مرکز کی پوری دلجمعی کے ساتھ خدمت کر سکیں جس کی خدمت پر وہ مامور کئے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا سورۂ ابراہیمؑ میں بھی نقل ہوئی ہے۔ وہاں کچھ الفاظ زیادہ ہیں جن سے وہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ فرمایا۔

| | |
|---|---|
| رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ | اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد میں |
| بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ | سے بعض کو ایک بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم |

| | |
|---|---|
| الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ | گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے ہمارے رب میں |
| فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ | نے اس لئے بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں پس |
| تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ | تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور |
| الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ۝ | ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ یہ تیرا شکر |
| (۳۷-ابراھیم) | ادا کرتے رہیں۔ |

اس دعا کے الفاظ پر اچھی طرح غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کے لئے یہاں اپنے رب سے دو چیزوں کی درخواست کی ہے اور اس درخواست کے حق میں دو چیزوں کو بطورِ سفارش پیش کیا ہے۔ درخواست تو یہ پیش کی ہے کہ تو لوگوں کے دِل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی دے اور اس کے حق میں سفارش یہ پیش کی ہے کہ یہ سرزمین زراعت سے بالکل محروم سرزمین ہے لیکن میں نے اپنی اولاد کو صرف اس لئے یہاں لا ڈالا ہے کہ یہ تیرے محترم گھر کی خدمت کریں اور تیری بندگی کی دعوت کے لئے نماز قائم کریں۔ غور کیجئے کہ جب ثمرات کی روزی کے لئے وہ وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ بن کھیتی کی زمین ہے تو ان کا مدعا ثمرات سے صرف میوہ جات تو نہیں ہو سکتے بلکہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ گلہ بانی اور شکار کی بدویانہ زندگی کی بے اطمینانیوں سے چھوٹ کر حضری زندگی کے سکون سے بہرہ مند ہوں کہ تیرے گھر اور تیرے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ آیت کے آخر میں لعلہم یشکرون کے جو الفاظ آتے ہیں وہ بھی نہایت معنی خیز ہیں یعنی میں ان کے لئے جو سکون کی زندگی [illegible] کا طالب ہوں تو اس لئے نہیں کہ ان کے لئے سامانِ عیش کی فراوانی چاہتا ہوں بلکہ صرف اس لئے اس کا طالب ہوں کہ وہ اپنے مشن کے لئے یکسو رہ کر زیادہ سے زیادہ تیری شکر گزاری کا حق ادا کر سکیں

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الآیہ۔ حضرت ابراہیمؑ نے رزق کے لئے جو دعا فرمائی اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ اس کے حق دار صرف وہی لوگ ٹھہریں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہوں۔ یقیناً یہاں یہ پیش بندی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس لئے فرمائی کہ اوپر امامت و خلافت کے معاملہ میں ان کو یہ صاف جواب مل گیا تھا کہ اس

عہد کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا جو شرک و کفر میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ بات سامنے تھی اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پر قیاس کر کے یہاں اپنی دعا میں از خود یہ قید لگا دی کہ میں یہ درخواست صرف اہل ایمان کے لئے کر رہا ہوں۔ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مرتبۂ تسلیم و رضا کا اندازہ ہوتا ہے جس پر وہ فائز تھے۔ اشارہ بھی اگر مل گیا ہے کہ فلاں سمت میں رب کی رضا ہے تو جھپٹ کر ادھر کو چل پڑے ہیں اگرچہ اس اشارہ کا مطلب بعد میں کچھ اور ہی واضح ہوا ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ امامت و خلافت اور معیشتِ دنیا کے معاملات کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کے نافرمان ہیں وہ خدا کی خلافت کے سزاوار تو ہرگز نہیں ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی نافرمانی کے سبب سے خدا ان کی روزی بھی چھین لے۔ روزی اللہ تعالیٰ نافرمانوں اور فرمانبرداروں دونوں کو اس حیاتِ چند روزہ میں دیتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس زندگی میں جو لوگ اس کے رزق سے نافرمانی کرتے ہوئے متمتع ہوتے ہیں ان کو مرنے کے بعد وہ دوزخ میں جھونک دے گا۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے وہ بڑی وضاحت کے ساتھ آگے مختلف سورتوں میں بیان ہوگی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔

---

مطالعۂ حدیث
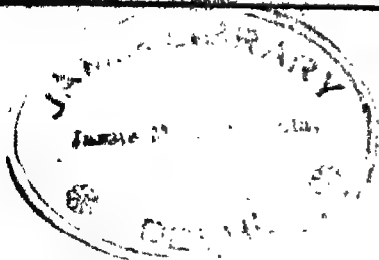
مولانا عبدالغفار حسن صاحب

# مِشْکلٌ مَعَسٌ

(۴)

اپریل کے شمارے میں قرآنی مضامین کے لحاظ سے حدیث کی تین اقسام نظائر و شواہد کے ساتھ بیان کی گئی تھیں۔ اس شمارے میں حدیث کی چوتھی قسم مع امثلہ و شواہد پیش کی جا رہی ہے (ع۔غ۔ح)

**مخالفِ قرآن روایات** مضمون کے لحاظ سے حدیث کی چوتھی قسم ایسی احادیث پر مشتمل ہے جو قرآنی آیات سے متصادم ہیں۔

واضح رہے کہ یہ تصادم و تعارض صرف ظاہر نظر میں ہے، جو معمولی غور و تامل سے رفع ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے اختلاف کو حقیقی تعارض نہیں قرار دیا جا سکتا۔

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔

نحن نقول قولا کلیا نشھد الله وملائکته، ان لیس فی حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم ما یخالف القرآن ولا ما یخالف العقل الصریح بل کلامه بیان للقرآن وتفسیر له وتفصیل لما

ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کو گواہ ٹھہراتے ہوئے (بغیر کسی استثناء کے) کلی اور عمومی طور پر یہ بات کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو قرآن کے مخالف ہو یا عقل صریح سے ٹکراتی ہو بلکہ آپ کے ارشادات قرآنی آیات کے بیان

| | |
|---|---|
| اجمله وکل حدیث من ردّ ؟ | تفسیریں اور قرآنی اجمال کی تفصیل و توضیح |
| بزعمه انه یخالف القرآن | ہیں۔ ہر وہ حدیث جس کو یہ خیال کرتے ہوئے |
| فهو مطابق للقرآن | رد کیا گیا ہے کہ وہ قرآن کے مخالف ہے |
| وغایته ان یکون زائدا | (واقعہ یہ ہے کہ) وہ قرآن کے مطابق ہے |
| علی ما فی القرآن و | انتہائی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اس قسم کی |
| هذا الذی امر رسول | روایات قرآن سے زائد مضمون پیش کرتی ہیں |
| الله صلی الله علیه وسلم | (لیکن واضح رہے کہ) ایسی روایات کے قبول کرنے |
| بقبوله (الصواعق المرسلة ج ۲ ص ۲۲۱) | کا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے |

**امثال و نظائر** حدیث کی زیر بحث قسم کی وضاحت کے لئے چند نظائر و شواہد پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فہم حدیث کے لئے کس قسم کی دیدہ وری کی ضرورت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

| | |
|---|---|
| إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ | بے شک میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی بنا پر عذاب دیا جاتا ہے۔ |

مطلب یہ ہے کہ اگر شخص کے مرنے کے بعد اس پر ماتم کیا جائے، نوحہ اور سینہ کوبی جیسے اعمال کا مظاہرہ ہو تو مردے کو اس کے رشتہ داروں کے ان اعمال کی بنا پر عذاب کا مزہ چکھنا پڑتا ہے اس حدیث کا ظاہری مفہوم قرآن مجید کی آیت وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (کوئی کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) سے متصادم ہے۔

امام بخاریؒ نے اس اشکال کو اس طرح رفع کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| اذا کان النوح من سنته | میت کو گھر والوں کے ماتم کی بنا پر عذاب اس |
| لقوله تعالیٰ قوا انفسکم | صورت میں ہوگا، جب کہ یہ نوحہ و ماتم خود اس |
| واهلیکم نارا وقال | کا طریق کار رہا ہو، کیونکہ قرآن میں ارشاد |

النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ فاذا لم یکن من سنتہ فھو کما قالت عائشۃؓ لا تزر وازرۃ وزر اخری، وھو کقولہ وان تدع مثقلۃ (ذنوبا) الی حملھا لا یحمل منہ شیئ

(صحیح بخاری مصری ج ۱ ص ۲۲۳)

ہے، اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔ اسی طرح ارشاد نبوی ہے تم میں سے ہر ایک راعی اور نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت (ماتحتوں) کے بارے میں باز پرس ہوگی، لیکن اگر اس کا یہ طرز عمل زندگی میں نہیں تھا تو اس شکل میں حضرت عائشہؓ کے قول کے مطابق آیت "لا تزر وازرۃ" اس پر چسپاں ہوگی یعنی اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی (اسی طرح) دوسری آیت میں ہے۔ کہ اگر کوئی گناہوں سے بوجھل شخص کسی دوسرے کو اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے بلائے گا تو اس کا بوجھ اٹھایا نہ جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اسی قسم کا طرز عمل اختیار کرتا ہے یا اس قسم کے منکرات پر وہ نفرت و بیزاری کا اظہار نہیں کرتا یا مرتے وقت سینہ کوبی اور نوحہ خوانی کی وصیت کر جاتا ہے تو ان سب صورتوں میں مذکورہ بالا احادیث کے مطابق وہ عذاب کا سزاوار ہوگا۔

دورِ جاہلیت میں اس نوع کی وصیت کرنے کا عام رواج تھا جیسا کہ طرفہ بن العبد اپنی بھتیجی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

فَاِنْ مِتُّ فَانْعِیْنِیْ بِمَا اَنَا اَھْلُہٗ
وَشُقِّیْ عَلَیَّ الْجَیْبَ یَا ابْنَۃَ مَعْبَدٖ

"یعنی اگر میں مر جاؤں تو میری موت کی خبر ایسی مدح سرائی کے ساتھ نشر کرنا۔ جس کا واقعی میں مستحق ہوں۔ اور اے بھائی معبد کی بیٹی! میرے مرنے پر اپنا گریبان چاک کرنا"

اس کے برعکس اگر مرنے والا اس قسم کے رسم و رواج سے نفرت کرتا ہے یا کم سے کم

اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتا رہا ہے تو خدا کے ہاں اس پر کوئی گرفت نہ ہو گی۔

جمہور اہلِ علم نے یہی توجیہ اختیار کی ہے، یعنی مذکورہ بالا قرآنی ضابطے کے مطابق زیرِ غور حدیث کا عموم اپنی جگہ قائم نہ رہا۔

یہ ایسی معقول توجیہ ہے جس کی بنا پر نہ قرآنی آیت کی تاویل کرنی پڑی اور نہ حدیث کو رد کرنے کی نوبت آئی۔

حضرت عائشہ رضؓ نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سہو و نسیان اور خطاءِ فہم پر محمول کیا ہے فرماتی ہیں کہ اصل بات یہ تھی کہ . . . .

| | |
|---|---|
| انما مر رسول اللہ صلی اللہ علیہ | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک بار |
| وسلم علی یھودیۃ یبکی علیھا | ایسی یہودیہ کی قبر کے پاس سے ہوا جس |
| اھلھا فقال انھم | کے گھر والے اس پر ماتم کر رہے تھے۔ آپ |
| لیبکون علیھا وانھا تعذب | نے فرمایا۔ یہ لوگ اس پر ماتم کر رہے ہیں یہ حالانکہ |
| فی قبرھا۔ | وہ اپنی قبر میں مبتلائے عذاب ہے۔ |

مطلب یہ ہے کہ اس یہودیہ کے رشتہ دار تو اس کی مدح و تعریف میں مشغول ہیں اور اس کے فراق میں نالہ و شیون بپا کیا ہوا ہے حالانکہ وہ اپنی بد اعمالیوں کی بنا پر عذاب کی سختیاں جھیل رہی ہے۔ یہاں نوحہ خوانی اور میت کے عذاب پانے کے درمیان علت و معلول کا تعلق نہیں ہے بلکہ دونوں امور اپنی اپنی جگہ الگ ہیں۔

صحیح مسلم کی روایت میں مزید یہ الفاظ ملتے ہیں

| | |
|---|---|
| قالت عائشۃ یغفر اللہ | حضرت عائشہؓ نے فرمایا اللہ تعالےٰ ابو |
| لابی عبد الرحمن اما انہ | عبدالرحمٰن (عبداللہ ابن عمرؓ) کو معاف فرمائے |
| لم یکذب ولکنہ، نسی او | اصل بات یہ ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولے |
| اخطاء۔ | ہاں ان سے بھول چوک اور خطا ہو گئی ہے |

حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کے بعض الفاظ میں راوی کا وہم بتاتے ہوئے حدیث کا ایسا منظر بیان کیا ہے کہ جس کی بنا پر قرآن و حدیث کے درمیان تعارض کا کوئی احتمال ہی

باقی نہیں رہتا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ یہ حدیث صرف حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہی سے مروی نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ دوسرے متعدد صحابہ بھی اس حدیث کے راوی ہیں (ملاحظہ ہو سبل السلام ج ۲ ص۱۵۳) اس لئے وہم راوی قرار دینے کے بجائے جمہور اہلِ علم کی توجیہہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔

امام قرطبیؒ نے تعارض کو رفع کرنے کے لئے ایک دوسرا نکتہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآنی آیت "لاتزر وازرۃ" کا تعلق آخرت سے ہے یعنی قیامت کے دن کوئی کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ باقی رہی مذکورہ بالا حدیث تو اس کا تعلق برزخی حالات سے ہے جو ایک گونہ دنیاوی احوال کے مشابہ ہیں۔ دنیاوی عذاب کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (اور اس فتنہ سے بچو جس کا نشانہ صرف ظالم لوگ ہی نہیں بنیں گے، بلکہ اس کی لپیٹ میں غیر ظالم بھی آجائیں گے)

اگر غور کیا جائے تو نتیجے کے لحاظ سے جمہور اہلِ علم کی توجیہہ اور اس نکتہ میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس مثال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ محدثین کرام نے قرآن و حدیث کے باہمی تعلق کو کیسے حکیمانہ اسلوب سے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے جزاھم اللہ عنا خیر الجزاء۔

اس صورتِ حال کی وضاحت کے لئے قرآن کی مندرجہ ذیل دو آیتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ مشرکین کے بارے میں سورۃ نساء (آیت ۴۲) میں فرمایا گیا ہے۔ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا۔ یعنی مشرکین قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے دوسری جگہ ارشاد ہے کہ مشرکین کہیں گے وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ (سورۃ انعام۔ ۲۳) یعنی قسم ہے ہمارے رب کی ہم مشرک نہ تھے۔

ظاہر۔۔ دو آیتوں میں تعارض ہے لیکن حضرت ابن عباسؓ نے اس کی توجیہہ یہ کی

ہے کہ مشرکین قیامت کے ابتدائی مرحلے میں تو اپنے شرک کا انکار ہی کریں گے لیکن جب منہ پر مہر لگ جائے گی اور اعضاء گواہی دیں گے تو پھر مشرکین کوئی بات اپنے رب سے مخفی نہ رکھ سکیں گے۔

جس طرح ان دونوں آیات کو مختلف حالات پر معمول کیا گیا ہے اسی طرح زیرِ بحث آیت اور حدیث کے دو محمل الگ الگ مانے جا سکتے ہیں۔

۲۔ قرآن سے متعارض ہونے کی دوسری نمایاں مثال صحیح بخاری کی وہ حدیث ہے جس میں ذکر ہے کہ کذب ابراہیم علیہ السلام ثلث کذبات۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے تین مواقع پر کذب بیانی سے کام لیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث قرآنی آیت وَاذْكُرْ فِي الْكِتَٰبِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا سے متصادم ہے کیونکہ قرآن تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انتہائی راست باز نبی قرار دیتا ہے لیکن حدیث سے ان کے تین جھوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ روایت ناقابلِ قبول ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کچھ غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ تعارض و اختلاف رفع ہو سکتا ہے۔

حافظ ابنِ قیمؒ لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| الكلام له نسبتان، نسبة الى المتكلم وقصده وارادته ونسبة الى السامع وافهام المتكلم اياه مضمونه فاذا اخبر المتكلم بخبر مطابق للواقع وقصد افهام المخاطب اياه، صدق بالنسبتين فان المتكلم ان قصد الواقع وقصد افهام المخاطب فهو | کلام و گفتگو کی دو نسبتیں یا حیثیتیں ہوتی ہیں (۱) متکلم کے قصد و ارادے کے لحاظ سے (۲) سامع کے اعتبار سے، یعنی متکلم سامع کے ذہن میں کیا بات اتارنا چاہتا ہے ان دو نسبتوں کے لحاظ سے کلام کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) متکلم اصل واقعہ کے مطابق خبر دے اور اس کی نیت بھی یہی ہو کہ صحیح صورتِ حال سے مخاطب آگاہ ہو جائے |

صدق من الجهتين وان قصد
خلاف الواقع وقصد مع ذلك
افهام المخاطب خلاف ما قصد
بل معنى ثالثا لا هو الواقع
ولا هو المراد فهو كاذب
من الجهتين بالنسبتين معًا
وان قصد معنى مطابقا صحيحًا و
قصد مع ذلك التعمية على المخاطب
وافهامه خلاف ما قصده
فهو صادق بالنسبة الى قصده،
كاذب بالنسبة الى افهامه
ومن هذا الباب التورية
والمعاريض، وبهذا اطلق
عليها ابراهيم الخليل
صلى الله عليه وسلم اسم الكذب
مع انه الصادق في خبره
ولم يخبر الا صدقا فتامل
هذا الموضع الذي اشكل
على الناس وقد ظهر بهذا
ان الكذب لا يكون قط
الا قبيحا، وان الذي
يحسن ويجب انما هو التورية
وهي صدق۔

یہ صورت مذکورہ بالا دونوں نسبتوں کے اعتبار
سے صدق پر مشتمل ہو گی۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ خلافِ واقعہ خبر
دی جائے اور جو متکلم کا مقصود ہے وہ بھی
مخاطب پر ظاہر نہ ہونے دیا جائے بلکہ کوئی تیسرا
مفہوم مخاطب کے ذہن میں اتارنے کی کوشش
کی جائے جو نہ واقعہ کے مطابق ہو اور نہ متکلم کا
مطمحِ نظر ہو، اس صورت کو دونوں نسبتوں کے
لحاظ سے کذب (جھوٹ) مانا جائے گا۔

(۳) تیسری شکل یہ ہے کہ متکلم کے پیشِ نظر
واقعہ کے مطابق صحیح خبر دینا ہی مقصود ہوتا ہے
لیکن وہ گفتگو کا اسلوب ایسا اختیار کرتا ہے
کہ مخاطب کا ذہن متکلم کے اصل مقصد
کو سمجھنے کے بجائے ایسے امر کی طرف
منتقل ہو جائے جو متکلم کا منشا نہیں
ہے۔

یہ صورت اصل واقعہ کے لحاظ سے
صدق ہے۔ لیکن مخاطب کے فہم کے اعتبار
سے اس پر کذب کا اطلاق ہو سکتا ہے
اس قسم کے اسلوبِ کلام کو توریہ اور تعریض
کہا جاتا ہے۔

اسی پہلو کے پیشِ نظر حضرت ابراہیمؑ نے
اس پر کذب کا اطلاق کیا ہے ورنہ اصل واقعہ

قد يطلق عليه الكذب بالنسبة الى الافهام لا الى الحقائق (مفتاح دار السعادة ومنشور العلم والارادة ج ۲ ص ۳۹)

کے لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ اس گفتگو میں سچے ہیں۔

حدیث کی اس تشریح و توضیح پر انتہائی غور و فکر کی ضرورت ہے یہ مقام بہت سے لوگوں کے ذہنی الجھن کا باعث بن گیا ہے۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ

کذب بہر حال قبیح ہوگا، ہاں کوئی امر اگر (بوقت ضرورت) پسندیدہ یا لازم ہو سکتا ہے تو وہ "توریہ" و تعریض ہو سکتا ہے (نہ کہ حقیقی کذب) یہ توریہ اصل واقعہ کے لحاظ سے صدق پر مشتمل ہوتا ہے، ہاں اس پر کذب کا اطلاق اس اعتبار سے کر دیا جاتا ہے کہ واقعہ کے مطابق اصل مقصود مخاطب کو باور کرانا مطلوب نہیں ہوتا۔

سردست ان دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی صحیح السند حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ اگر کہیں قرآنی آیت اور حدیث کے درمیان بظاہر تعارض محسوس بھی ہوتا ہے تو معمولی غور و فکر سے اس کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے قرآنی آیات کے باہمی تعارض و اختلاف کو بآسانی دور کیا جا سکتا ہے۔ حدیث کو پرکھنے کا ایک معیار عقل بھی شمار کی جاتی ہے ولیکن سوال یہ ہے کہ کس کی عقل؟ اگر عقل سے مراد وہ عقل ہے جو روسی اشتراکیت، فرنگی تہذیب یا امریکی ثقافت سے مرعوب ہو تو حدیث کی کیا بساط ہے خود قرآن بھی اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتا اور اگر عقل سے مراد عقلِ سلیم ہے جو قلبِ منیب کی نگرانی میں ہو تو اس شکل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ کوئی حدیث بھی خلافِ عقل نہیں پیش کی جا سکتی۔

---

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

# اسلام اور انسانی حقوق

## (۲)

اسلام جس طرح ہر شخص کی جان، مال اور عزت و آبرو کو قابل احترام قرار دیتا ہے اسی طرح وہ ہر شخص کو آزادی اور اختیار کی نعمت سے بھی نوازتا ہے۔ چنانچہ فکر و خیال، عقیدہ و مسلک، قول و عمل اور رائے و اجتہاد میں ہر شخص آزاد ہے۔ اسی طرح مال و دولت اور اسباب و جائداد میں ہر فرد کو مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔ ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ اپنے مال و جائداد میں جس طرح کا تصرف چاہے کرے۔ اس سلسلہ میں اولاً تو اسلام کوئی پابندی عائد نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو اس کی ٹھیک وہی نوعیت ہوتی ہے جیسے کوئی مخلص اور ناصح طبیب مریض کو مضر اشیاء کے استعمال سے یا کوئی شفیق اور مہربان باپ اپنے بچے کو آگ میں ہاتھ ڈالنے یا بری عادتوں اور غلط حرکتوں سے باز رکھتا ہے۔ اس لئے اگر اسلام میں کچھ پابندیاں نظر آتی ہیں تو اولاً تو وہ نامناسب نہیں ہیں دوسرے ان کا مقصد نہ تو کسی کی آزادی و اختیار میں رکاوٹ ڈالنا ہوتا ہے اور نہ ہی اسے اس کی ملکیت سے دستبردار کرنا۔ ذیل میں ان مراعات اور حقوق کی تفصیل بیان کی جاتی ہے جو اسلام نے ہر فرد کو عطا کئے ہیں۔

**آزادئ فکر** اسلام عقل و فطرت کا دین ہے، اس کی بنیاد جہالت کے بجائے علم و بصیرت پر ہے اور یہ اس کا بڑا احسان اور اہم خصوصیت ہے کہ وہ ہر شخص کو سوچنے سمجھنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔ خدا نے ہر شخص کو آنکھیں اس لئے دی ہیں

کہ وہ ان سے دیکھے، کان اس لئے دیئے ہیں کہ وہ خود ان سے سنے اور دل و دماغ اس لئے عطا کیا ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کی سمجھ پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنی عقل سے کام لے۔

اسلام نہ صرف سوچنے سمجھنے کی پوری آزادی دیتا ہے بلکہ بار بار فکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے تاکہ آدمی حق و ناحق، صحیح و غلط اور خیر و شر میں پورے شعور اور بصیرت کے ساتھ تمیز کرے اور یہ واقعہ ہے کہ جب آدمی بلا سوچے بوجھے محض دوسروں کو دیکھ کر کوئی طریقہ اختیار کر لیتا ہے تو اس میں کبھی پختگی اور استحکام نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ خود اس پر اچھی طرح مطمئن ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلام کسی بات کو بغیر حجت و دلیل کے ماننے پر مجبور نہیں کرتا یہاں تک کہ دینِ برحق کو بھی زبردستی اختیار اور قبول کرنے کی دعوت نہیں دیتا۔ اس کے برعکس وہ آدمی کی عقل، فیصلہ، تجربہ اور بصیرت سے اپیل کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دینِ حق کو اختیار کیا جائے تو سوچ اور سمجھ کر اور پورے شعور اور ادراک کے ساتھ اختیار کیا جائے۔ اس کا صاف اعلان یہ ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (بقرہ ۲۵۶) — دین کے قبول و اختیار میں کوئی جبر نہیں، ہدایت خود گمراہی سے نمایاں اور واضح ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فطری طور پر اس کی خواہش تھی کہ سارے لوگ خدا پرستی کا رویہ اختیار کر کے حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کو بتایا کہ یہ ممکن نہیں کہ سب لوگ تمہاری بات مان لیں۔ اور اگر نہیں مانتے تو اس میں تمہارا کیا بگڑتا ہے جو تم اس قدر پریشان ہو رہے ہو۔ کسی کے ساتھ زبردستی تو نہیں کی جا سکتی۔ فرمایا۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس ۹۹) — کیا تم لوگوں کو مجبور کر دو گے کہ وہ ایمان لائیں۔

**دینِ فطرت کے مطابق ہے**

یہی وجہ ہے کہ دین و شریعت کے تمام مسائل عقل و فطرت کے عین مطابق بنائے گئے ہیں تاکہ آدمی اگر واقعی اپنی عقل اور سمجھ سے کام لے تو بھی اسے غلطی نہ ہو۔ علماء اسلام نے اپنی کتابوں میں اسلامی احکام و شرائع

حکمتوں اور مصلحتوں کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اور
ان کے شاگرد حافظ ابن قیم (رحمہما اللہ) نے اپنی تصنیفات میں یہ ثابت کیا ہے کہ شریعت
ر دین کا کوئی حکم بھی خلافِ عقل و قیاس نہیں اور جن مسائل کو خلاف قیاس سمجھا اور بتایا جاتا
ہے ان کی دو وجہیں ہیں یا تو قیاس ہی فاسد ہوتا ہے یا وہ حکم نص وصریح سے ثابت نہیں ہوتا
حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں شریعت کے جزئیات تک کے
متعلق لکھا ہے کہ وہ خالی از حکمت و مصلحت نہیں۔ اسی لئے شروع ہی سے صحابہ کرامؓ میں
بھی ایک گروہ ایسا رہا ہے جو ہر معاملہ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے احکام شریعت کے اسباب و مصالح معلوم کرتا تھا اور ان میں بحث و تدقیق کا عادی تھا،
اور جو باتیں خلاف عقل معلوم ہوتی تھیں ان کو ماننے میں اسے تامل ہوتا تھا۔ جن علماء
سلف کو اس معاملہ میں محتاط سمجھا جاتا ہے اور وہ جو مسائل کی بحث و تفتیش میں نہیں پڑتے
تو ان کا بھی یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ دین کو عقل و فطرت کے مطابق نہیں سمجھتے بلکہ وہ انسانی عقل کو
اس قدر محدود اور ناقص بتاتے ہیں کہ حکمتِ ربانی کا فہم و ادراک اس کے بس سے باہر سمجھتے ہیں
ان کی یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے کیونکہ آج کل کی بعض جدت پسند طبیعتیں جو صحیح فکر و استدلال
سے ناآشنا ہوتی ہیں، ہر معاملہ کے متعلق فوراً ہی خلافِ عقل ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتی ہیں۔
حالانکہ وہ دراصل خلاف عقل نہیں ہوتے بلکہ یہ ان حضرات کی ظاہر بینی اور فتورِ عقل ہے
جو انہیں ہر بات کو خلافِ عقل کہنے پر مجبور کرتی ہے۔

### قرآن اور دعوتِ فکر و نظر

یہ ایک ضمنی بحث تھی، اصل گفتگو یہ تھی کہ اسلام انسان کو سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی پوری آزادی
دیتا ہے۔ قرآن مجید کا کوئی ٹکڑا بھی دعوتِ فکر و نظر سے خالی نہیں، وہ بار بار انسانی ذہن و
دماغ کو غور و خوض کی تلقین کرتا ہے، قیاس و استنباط سے مسلمات اور نتائج اخذ کرنے
کی تعلیم دیتا ہے۔ توحید، رسالت اور جزاء و سزا جیسے مسلمات اور حقائق بھی بربنائے بصیرت تسلیم
کرانا چاہتا ہے، آسمان و زمین اور ان کے مابین کی چیزوں کی تخلیق خدا کی قدرت و حکمت
کے ... مظاہر ... جو ... خلقت ... غور و فکر کرنے کی اہمیت بیان

کرتا ہے تاکہ اس کی عقل و بصیرت اسے اصل حقیقت اور صحیح نتیجہ تک پہنچا دے۔ اس طرح کی آیات بے شمار ہیں جن میں انسان کو اس نوعیت سے غور و فکر کرنے اور عقل و دانائی سے کام لینے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں۔

| | |
|---|---|
| أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم مَّا خَلَقَ | کیا یہ لوگ اپنے تئیں سوچتے نہیں کہ اللہ نے |
| اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ إِلَّا بِالْحَقِّ | آسمانوں اور زمین کو مقصد کے ساتھ اور ایک |
| وَأَجَلٍ مُّسَمًّى وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ | مقررہ مدت تک کے لئے پیدا کیا ہے لیکن |
| النَّاسِ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ | اکثر لوگ اپنے رب سے ملنے کا انکار کرتے |
| لَكَافِرُونَ (روم ۸) | ہیں۔ |

ایک اور جگہ فرمایا۔

| | |
|---|---|
| قُلِ انظُرُوا مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ | کہہ دو کہ ذرا دیکھو تو جو کچھ آسمانوں اور زمین |
| وَالْأَرْضِ (یونس ۱۰۱) | میں ہے۔ |

دوسری جگہ آسمان و زمین کی حکمرانی اور نظام پر غور کرنے کے لئے کہا گیا۔

| | |
|---|---|
| أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ | کیا یہ لوگ آسمان اور زمین کی بادشاہی میں |
| وَالْأَرْضِ (اعراف ۱۸۴) | غور نہیں کرتے۔ |

انسان کی جس حقیر نطفہ سے پیدائش ہوئی ہے اس پر غور کرنے کے لئے کہا گیا ہے، تاکہ وہ قیامت اور بعث بعد الموت کا انکار نہ کر سکے۔

| | |
|---|---|
| فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ خُلِقَ مِن | انسان کو غور کرنا چاہیئے کہ کس چیز سے وہ |
| مَّاءٍ دَافِقٍ (طارق ۵، ۶) | پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلنے والے پانی سے۔ |

آفاق و انفس میں غور کرنے کی اہمیت بیان کرنے کے بعد ان لوگوں کو ملامت کی جاتی ہے جو نظر و بصیرت سے کام نہ لینے کی وجہ سے جادۂ مستقیم سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ | زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے |
| وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ | لئے اور خود تمہارے اندر بھی کیا تمہیں سجھائی |
| (ذاریات ۲۰-۲۱) | نہیں دیتا؟ |

قرآن مجید اپنی آیات میں غور و فکر کی تلقین کرتا ہے اور جو لوگ غور و فکر نہیں کرتے انھیں سخت الفاظ میں تنبیہ کرتا ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (محمد ۲۴) — کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔

قرآن مجید میں قصے اور مثالیں بھی اس لئے بیان کی گئی ہیں تاکہ لوگ غور و فکر سے کام لے کر درست حقائق تک پہنچ جائیں اور عبرت و تذکر حاصل کریں۔

تِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (حشر - ۲۱) — یہ مثالیں ہم لوگوں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔

سورۂ اعراف میں ہے۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (اعراف ۱۷۵) واقعات بیان کرو تاکہ لوگ فکر سے کام لیں۔

اقوام و ملل کی حکایت اور امم معذبہ کی داستانِ ہلاکت و بربادی کے ذکر کا مقصد بھی تنبیہ، تذکیر اور لوگوں کو آمادۂ غور و فکر کرنا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ (یوسف ۷) — یوسف اور ان کے بھائیوں (کی حکایت) میں پوچھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

سورۂ یوسف کے آخر میں پوری حکایت کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد فرمایا۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ (یوسف ۱۱۱) — ان کے قصوں میں عقل مندوں کے لئے عبرت کا سامان ہے۔

اسی طرح متعدد واقعات اور قصوں کے ذکر کے بعد اس طرح آیتیں بیان کی ہیں۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِلْمُتَوَسِّمِينَ (حجر ۷۵) بلاشبہ اس میں تاڑ جانے والوں کے لئے نشانیاں ہیں

کہیں فرمایا۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ (ق ۳۷) — بلاشبہ اس میں اس کے لئے یاد دہانی اور نصیحت ہے جس کے پاس قلب ہو اور وہ کان لگا کر پوری توجہ سے سنتا ہو۔

غرضیکہ اس طرح کی آیات جن میں انسان کو فکر و نظر اور غور و استدلال کی دعوت دی گئی ہے اور فقہ و بصیرت سے کام نہ لینے والوں کو ملامت کی گئی ہے اس کثرت سے ہیں کہ ان کا استقصار دشوار ہے ۔ بے شمار آیات کی ابتداء اَوَلَمْ يَنظُرُوا ، اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا ، اَوَلَمْ يَسِيرُوا اور اختتام اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَعِبْرَةً ، لَعِبْرَةً لِمَن يَّخْشٰى ، لَذِكْرٰى ، لِذِكْرٰى لِاُولِي ، لَاٰيَةً ، لَاٰيَاتٍ يا لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ ، يُوْقِنُوْنَ ، يَعْلَمُوْنَ ، اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ، اَفَلَا تَنْظُرُوْنَ وغیرہ الفاظ و کلمات پر ہوتا ہے جس کا منشاء انسان کو سوچنے سمجھنے اور غور و فکر پر آمادہ کرنا ہوتا ہے ۔ اور غور و فکر ، نظر و تدبر کی تلقین ، حکمت و دانائی اور ہوش و حواس سے کام لینے کی ترغیب سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو انسانی ذہن و فکر کی آزادی کا کس قدر خیال ہے ۔

(باقی)

---

(بقیہ از صفحہ ۲۷)

کمزوریوں کا پورا پورا لحاظ ہے ، اس میں تدریج اور تربیت کا اہتمام ہے ۔ یہ انکشاف ان لوگوں کے لئے بڑی قیمتی دولت ہے جو شریعت کے اسرار و رموز پر غور کرتے ہیں اور اس کے اصل فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اسی انکشاف سے ان کے لئے حکمت کی راہیں کھلتی ہیں اور معرفت کی راہ میں ان کے قدم مضبوط ہوتے ہیں ۔

---

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

# نسخ سے متعلق دو سوال

میثاق کے گزشتہ شمارے میں تفسیر سورۂ بقرہ کے تحت نسخ کی جو بحث شائع ہوئی ہے اس کو پڑھ کر ایک قاری کے ذہن میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ اگر مختلف ادیان یا شرائع کے ذریعہ انسانی ذہن کی تربیت کی جاتی رہی ہے اور انبیائے کرام خوب سے خوب تر دین پیش کرتے چلے آئے ہیں تو آخر یہ سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر کیوں ختم ہو گیا ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اس کے بعد بھی بدستور ترقی کے مدارج طے کرتا چلا جا رہا ہے۔ آخر یہ کیسے فرض کر لیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں انسانی ذہن جس معیار تک پہنچ گیا ہے اس کے بعد وہ اس سے اوپر نہیں سوچ سکتا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ منسوخ آیات کو باقی رکھنے میں کیا حکمت ہے جب کہ وقتی یا ہنگامی قسم کے احکام وحی خفی کے ذریعہ سے دیئے جا سکتے تھے اور غیر متبدل احکام قرآن مجید میں رکھے جا سکتے تھے۔

امید ہے ان دونوں سوالوں کے مفصل جواب مرحمت فرمائیں گے:

جواب:

۱۔ آپ کے پہلے سوال کا جواب میں نے اپنی کتاب "اسلامی قانون کی بنیادیں" میں دیا ہے اس کی تمام قسطیں میثاق کی پچھلی اشاعتوں میں نکل چکی ہیں۔ اگر آپ اس میں سے اسلامی قانون کے ارتقاء کی فصل پڑھ لیتے تو مجھے توقع ہے کہ آپ کا شبہ صاف ہو جاتا۔ ایک لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ لکھنا اگرچہ طبیعت پر گراں سا گزر رہا ہے لیکن آپ کی الجھن دور کرنے کے لئے مختصراً پھر

عرض کرتا ہوں۔ اس مسئلہ سے متعلق دو باتیں نگاہ میں رکھیئے۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں ہر چیز کی ترقی کی ایک خاص حد ہے جس پر پہنچ کر وہ اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ یہاں کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو ترقی و عروج کی غیر محدود صلاحیتیں لے کر آئی ہو۔ شجر و حجر سے لے کر انسان تک گیاہ اور پہاڑ سے لے کر مہر و ماہ تک جتنی بھی مخلوقات ہیں سب محدود اور پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر فانی ہیں۔ غیر محدود اور ابدی و ازلی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ افراد بحیثیت افراد کے، قومیں بحیثیت اقوام کے اور یہ کائنات بحیثیت مجموعی سب ایک ہی قانون کے تابع ہیں۔ سب کے عروج و کمال کی ایک خاص حد ہے اور پھر بالآخر سب کے لئے زوال اور فنا ہے۔ اگر ہم انسان کی ترقی کو غیر محدود مان لیں تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہم نے اس کو خدا مان لیا اور اگر ہم اس دنیا کی ترقی کو غیر محدود مان لیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم دنیا کو ازلی و ابدی قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ ایمان باللہ کے بھی منافی ہے اور ایمان بالآخرت کے بھی۔ اس وجہ سے یہ خیال تو کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ انسان اس دنیائے فانی میں غیر محدود صلاحیتوں کا مالک ہے۔ جس طرح افراد کو آپ دیکھتے ہیں کہ بچپن کے دور کے بعد ان پر ایک دور بلوغ اور سنِ رشد کا آتا ہے جس میں وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنے حقوق و فرائض پہچان سکیں اور اس حیاتِ دنیوی سے متعلق اپنی ذمہ داریاں سمجھ سکیں اسی طرح انسان پر بحیثیت مجموعی بھی بلوغ اور سنِ رشد کا ایک دور آیا جب وہ اس شریعت کا حامل ہو سکا جو تمام بنی نوع انسان کے لئے یکساں اور رہتی دنیا تک اس کی رہنمائی کے لئے کفایت کرنے والی ہے۔ ہمارے نزدیک انسانیت کے سنِ رشد کا یہی دور ہے جس میں اسلامی شریعت نازل ہوئی چنانچہ اس کے نزول کے بعد دین کی تکمیل کا بھی اعلان کر دیا گیا اور سلسلۂ نبوت کے خاتمہ کا بھی۔ اب اگر کوئی شخص ہمارے اس عقیدہ سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ وہ یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ انسان کے عروج و ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہے گا اس کے لئے کوئی حد و نہایت نہیں، ہم جس دور کو انسانیت کا سنِ رشد قرار دیتے ہیں وہ اس کو بھی دورِ مخلوقیت قرار دیتا ہے تو اس کے اور ہمارے عقائد میں بنیادی اختلاف ہے۔ وہ درحقیقت انسان اور کائنات کو غیر فانی مانتا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو وہ خود انسان کو خدا مانتا ہے۔ میرے

نزدیک یہ چیز بذاتہٖ کفر و شرک ہے۔ اگر ہم اس نظریہ کو تسلیم کر لیں تو ہمیں اس تصور سے لازماً دستبردار ہونا پڑے گا جو اس کائنات اور اس کے اندر بسنے والے انسان سے متعلق قرآن نے ہمیں دیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر شریعت الٰہی کی تکمیل ہو گئی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بس اس کے بعد اب شریعت کی ترقی رک گئی، اب نہ انسان کوئی نئی بات سوچے گا اور نہ کسی معاملہ میں شریعت کی رہنمائی کا محتاج ہو گا بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ انسانیت کی رہنمائی کے لئے اس دنیا میں جو اصول ضروری تھے وہ اصول اللہ تعالےٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے انسان کو دیدیئے یہ اصول اس بات کے لئے کافی ہیں کہ رہتی دنیا تک انسان تمام پیش آنے والے معاملات میں ان کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لئے ایک کسوٹی کے طور پر استعمال کر سکے۔ اصولوں کے متعلق یہ بات آپ جانتے ہوں گے کہ جزئیات کی طرح وہ معین حالات ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتے بلکہ ایک اصول سے ہزاروں لاکھوں جزئیات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اصول و کلیات سے جزئیات مستنبط کرنے کے کام کو اسلامی شریعت میں اجتہاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس اجتہاد کا کام یہ ہے کہ زندگی میں جتنے مسائل بھی پیدا ہوں ان سب کو اسلامی شریعت کے اصولوں اور اس کے مزاج پر پرکھ کر یہ حکم لگائے کہ ان میں سے کون سی بات اسلام کے مزاج سے موافق ہے اور کون سی ناموافق۔ ہمارے ہاں فقہ کا سارا ذخیرہ اسی اجتہاد کی بدولت ظہور میں آیا ہے اور یہ سارا ذخیرہ انہی مسائل سے متعلق ہے جو انسان نے نئے سوچے اور پیدا کئے ہیں۔ اسی طرح آئندہ بھی جو مسائل پیدا ہوں گے ان کے حل کے لئے یہ اجتہاد کفایت کرے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمان اس اصول سے کام نہ لیں یا غلط کام لیں۔ ان دونوں باتوں میں سے کسی بات کی بھی ذمہ داری اسلام پر نہیں عائد ہوتی بلکہ خود مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔

۲۔ آپ کے دوسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ منسوخ احکام کے قرآن مجید میں باقی رکھنے میں بہت سی مصلحتیں ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ قرآن مجید کی معنویت کے نقطۂ نظر سے ان کا قرآن مجید میں باقی رکھا جا

ضروری تھا۔ اگر یہ نکال دیئے جاتے تو بہر حال ان کے نکالے جانے کی روایت لوگوں میں باقی رہتی کہ فلاں فلاں احکام قرآن میں تھے جو منسوخ ہو جانے کے سبب نکال دیئے گئے۔ یہ روایات معلوم نہیں کن کن شکلوں میں اگلوں سے پچھلوں کی طرف منتقل ہوتیں اور پھر معلوم نہیں مخالفینِ اسلام ان کو قرآن کی محفوظیت کو مشتبہ ثابت کرنے کے لئے کس کس طرح استعمال کرتے۔ ان کے باقی رکھے جانے کی وجہ سے یہ کہنے کا کسی کے لئے موقع باقی نہیں رہا کہ قرآن کا کوئی ایک نقطہ یا شوشہ بھی کم و بیش ہوا ہے بلکہ ہم پورے اعتماد کے ساتھ یہ دعوے کرنے کی پوزیشن میں ہیں کہ قرآن کی وہ آیات بھی قرآن میں بعینہٖ محفوظ ہیں جو منسوخ ہو چکی ہیں۔

دوسری مصلحت اس میں یہ ہے کہ جو احکام منسوخ ہوئے ہیں ان میں سے سب پورے کے پورے منسوخ نہیں ہو گئے ہیں بلکہ بیشتر ایسے ہیں جن میں نسخ کی نوعیت صرف ترمیم کی کی ہے۔ مثلاً وصیت کا حکم آیاتِ میراث کے ذریعہ سے وارثوں کے لئے تو منسوخ ہو گیا لیکن غیر وارثوں کے لئے اس کی اجازت ثلث مال کے حد تک باقی رہی۔ اسی طرح روزے کے معاملہ میں اصل حکم تو باقی رہا لیکن بعض رعایات منسوخ ہو گئیں۔ علیٰ ہذا القیاس بعض احکام کا وجوب تو منسوخ ہو گیا لیکن ایک نفلی نیکی کی حیثیت سے اب بھی وہ قائم ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے احکام کا باقی رکھا جانا ضروری تھا۔ اگر ناسخ اور منسوخ دونوں باقی نہ رکھے جاتے تو اصل اور ترمیم میں امتیاز کس طرح ہوتا۔

تیسری یہ کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی اس رافت و رحمت کا ہمیں علم ہوتا ہے جو اس نے اس شریعت کے دینے میں ہمارے لئے ملحوظ رکھی ہے۔ بالخصوص وہ احکام جو سخت پر مخصوص حالات میں واجب ہوئے لیکن پھر ہمارے ضعف پر نگاہ کر کے ان میں تخفیف کر دی گئی اس رافت و رحمت کا خاص مظہر ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری شریعت اس قسم کے اصر و اغلال سے بالکل پاک ہے جس قسم کے اصر و اغلال یہود کی شریعت میں موجود ہیں۔

چوتھی مصلحت اس میں یہ ہے کہ ان منسوخات سے اسلامی شریعت کا اصل مزاج نمایاں ہوتا ہے کہ اس کی ہر بات میں حکمت و مصلحت ہے، اس میں بندوں کی ضروریات اور ان کی

اقتباسات نذیر احمد
جناب خالد مسعود صاحب

# حقیقت شناس ذہن کی منزل

(یہ مضمون البعث الاسلامی لکھنؤ کے ایک حالیہ شمارہ میں سے ترجمہ کیا گیا ہے)

حاتم اصم حضرت شقیق بلخی رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ استاد نے شاگرد سے پوچھا "تمہیں میرے ساتھ رہتے ہوئے کتنی مدت ہوگئی ہے؟" حاتم نے جواب دیا "تیس برس ہوئے ہیں۔" انھوں نے پھر سوال کیا "اس مدت میں تم نے مجھ سے کیا سیکھا ہے؟" کہنے لگے "آٹھ مسائل سیکھ لئے ہیں" شقیق نے غصے میں کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون تمہارے ساتھ میری ساری عمر کھپ گئی اور تم ہو کہ ابھی تک آٹھ ہی مسائل سیکھ سکے ہو"

حاتم نے جواب دیا۔

"میرے استاذ، مجھے جھوٹ بولنا پسند نہیں۔ میں واقعی ٹھیک بتا رہا ہوں کہ میں نے ان آٹھ مسائل کے سوا کچھ نہیں سیکھا" "اچھا بتاؤ یہ آٹھ مسائل کون سے ہیں، میں بھی تو سنوں"

استاذ نے سوال کیا۔

حاتم کہنے لگے "میں نے مخلوق کو دیکھا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہاں ایک آدمی دوسرے آدمی سے محبت رکھتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ محب اور محبوب دونوں قبر میں جا پہنچتے ہیں قبر میں جانا ان کے فراق کا موجب ہوتا ہے لہٰذا میں نے نیکیوں کو اپنا محبوب بنایا۔ اس لئے جب میں قبر میں جاؤں گا میرا محبوب بھی میرے ہمراہ ہوگا۔"

"حاتم! تم نے سچ کہا۔ اچھا دوسرا مسئلہ بتاؤ" شقیق نے کہا۔

حاتم نے جواب دیا "میں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ

رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (لیکن جو شخص اپنے پروردگار کے آگے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اس نے خواہشات سے اپنے نفس کو روکا تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگی) پر غور کیا تو اسے برحق سمجھا۔ چنانچہ میں نے اپنے نفس کے ساتھ اس قدر جہاد کیا کہ بالآخر اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے جھکا لیا۔"

"تم نے سچ کہا۔ اچھا تیسرا مسئلہ بیان کرو۔" شقیق نے کہا۔

حاتم نے جواب دیا۔ "میں نے مخلوقات پر غور کیا تو دیکھا کہ جس کے قبضے میں کوئی چیز ہے اس کی نظر میں اس چیز کی قیمت بھی ہے اور اس کی قدر و منزلت اور حفاظت کا بھی ایک خاص مقام ہے۔ پھر میں نے کلامِ الٰہی پر غور کیا کہ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (جو کچھ تمہارے پاس ہے۔ وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے) اس کے بعد جب بھی کوئی چیز قدر و قیمت والی میرے سامنے آئی میں نے اسے اللہ ہی کی طرف لوٹا دیا تاکہ وہ خدا کے ہاں باقی رہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا۔ اچھا چوتھا مسئلہ کیا ہے۔" شقیق نے پوچھا۔

حاتم نے کہا "میں نے مخلوق کے بارے میں سوچا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ تمام لوگ حسب نسب اور شرف و مال پر لپکتے ہیں حالانکہ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ پھر جب میں اس حکم خداوندی کی طرف متوجہ ہوا کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (بلاشبہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے) تو میں نے تقوٰی کو اختیار کیا تاکہ اللہ تعالےٰ کے ہاں عزت پاؤں۔"

"تمہاری بات درست ہے۔ پانچواں مسئلہ بیان کرو" شقیق نے کہا۔

"میں نے دیکھا کہ لوگ ایک دوسرے کو مطعون کرتے اور ملعون قرار دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ان کے باہمی جھگڑے اور دشمنیاں ہیں۔ مجھے قرآن مجید میں یہ قول ملا کہ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (ہم نے لوگوں کے درمیان ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا) تو میں نے تمام جھگڑے ترک کر دیئے۔ لوگوں سے اجتناب کیا اور

"تم نے ٹھیک سمجھا۔ چھٹا مسئلہ کیا ہے؟" شقیق نے پوچھا۔

"میں نے لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرتے اور آپس میں لڑتے دیکھا تو میں خدا کے اس فرمان کی طرف متوجہ ہو گیا کہ اِنَّ الشَّیْطَانَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا (شیطان تمہارا دشمن ہے لہٰذا اسکو دشمن سمجھو) پھر میں نے صرف شیطان کو اپنا دشمن سمجھا اور چونکہ خود خدا نے اس کی دشمنی کی گواہی دی تھی اس لئے میں اس سے بچنے کی کوشش میں لگ گیا۔ مخلوق کی عداوت میں نے بالکل ترک کر دی۔" حاتم نے جواب دیا۔

"تم نے ٹھیک کہا۔ ساتویں بات کونسی ہے؟" شقیق نے دریافت کیا۔

"میں نے لوگوں کو دیکھا کہ کثرت کی طلب میں سر توڑ کوشش کرتے ہیں اور اس کی خاطر ان حدود میں بھی داخل ہو جاتے ہیں جو ان کے لئے حلال نہیں ہوتیں۔ پھر مجھے خداوند تعالےٰ کا یہ فرمان ملا کہ وَمَا مِنْ دَابَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (زمین میں کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ تعالےٰ کے ذمہ نہ ہو) چنانچہ میں نے لوگوں پر اپنے حقوق کا خیال چھوڑ دیا اور ان واجبات کا خیال کرنے لگا جو میرے اوپر اللہ تعالےٰ کے ہیں۔" حاتم نے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا۔ اچھا آٹھواں مسئلہ بتاؤ۔" شقیق نے سوال کیا۔

"میں نے لوگوں پر نظر کی تو کسی کو اپنے سر و سامان پر اور کسی کو اپنی تجارت یا صحت پر بھروسہ کئے ہوئے پایا۔ گویا مخلوق مخلوق ہی پر بھروسہ کئے ہوئے تھی۔ میں نے خدا کے اس فرمان پر عمل کیا کہ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (جس نے اللہ پر بھروسا کیا تو اس کے لئے وہی کافی ہے) چنانچہ میں نے صرف خدا پر بھروسہ کیا۔ وہی میرے لئے کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔" حاتم نے جواب دیا۔

شقیق نے کہا۔ "حاتم! میں نے تورات، انجیل، زبور اور قرآن سب میں غور کیا تو اسی نتیجہ تک پہنچا کہ ہر قسم کی نیکیاں انہی آٹھ مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ جس نے ان مسائل پر عمل کیا اس نے گویا ان چاروں آسمانی کتابوں پر عمل کیا۔ اللہ تعالےٰ تمہیں بھی عمل کی توفیق دے۔"

تقریظ و تنقید

# دینِ اسلام حصّہ دوم

تصنیف :- مولوی محمد علی

ترجمہ :- مرتضیٰ خاں حسن بی۔اے

شائع کردہ :- احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور۔

جماعتِ احمدیہ کے علماء میں سے ایک صاحبِ تصنیف عالم مولوی محمد علی گزرے ہیں ان کا نام قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ اور حاشیہ کے مصنّف کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ ان کی ایک کتاب THE RELIGION OF ISLAM کے نام سے انگریزی زبان میں مدّت ہوئی شائع ہو چکی ہے۔ احمدیہ انجمن نے اسی کتاب کا اردو ترجمہ "دینِ اسلام" کے نام سے شائع کیا ہے جس کا دوسرا حصّہ ہمیں بغرض تبصرہ بھیجا گیا ہے۔

فاضل مصنف کے پیشِ نظر اس کتاب کے لکھنے کا جو مقصد رہا ہے وہ یہ ہے کہ مغربی ممالک میں اسلام کا تعارف کرایا جائے۔ اس غرض سے زیرِ نظر کتاب میں انہوں نے ارکانِ اسلام کا تعارف نہایت تفصیل سے کرایا ہے۔ چونکہ کتاب غیر مسلموں کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے اس میں ان چیزوں کا تعارف بھی موجود ہے جو ہمارے ہاں جانی پہچانی ہیں۔ اور جن کا بیان یہاں کے لوگوں کے لئے محض تحصیل حاصل ہے۔ مثلاً مساجد، ہیئتِ نماز، نمازِ جمعہ و عیدین، وضوء، غسل وغیرہ۔ مصنف بہرحال داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ارکانِ اسلام کے تمام گوشوں کو لیا ہے اور ہر وہ چیز بیان کی ہے جو ایک ناواقف آدمی کے جاننے کی ہو سکتی تھی۔ کتاب کے حاشیہ میں انہوں نے حوالے بھی بڑی کثرت سے دیئے ہیں علاوہ اس کے لئے

قاری اصل کتابوں کی طرف بآسانی رجوع کر سکتا ہے۔ قارئین کو مصنف سے فقہی اختلافات کئی جگہ ہوں گے کیونکہ وہ لبا اوقات اپنا اجتہاد بھی پیش کر دیتے ہیں۔

ہمارا تاثر یہ ہے کہ مصنف ان مواقع پر جہاں مغربی لوگوں کے لئے اسلام کے کسی حکم پر اعتراض کی گنجائش ہو سکتی تھی، اسلام کی تعلیمات کی ایسی تاویل کر دیتے ہیں جو ان کے مخاطبین کے لئے قابلِ قبول ہو سکے۔ مثال کے طور پر مساجد میں مستورات کی آمد و شد کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ ابتدائے اسلام کی اس اجازت کو اب بھی باقی رکھنا چاہتے ہیں جو نمازوں میں مستورات کی شمولیت کے بارے میں دی گئی تھی۔ ان کی نظر میں مسلمانوں نے خواہ مخواہ عورتوں سے نماز باجماعت کا حق سلب کر لیا ہے۔ ایک جگہ تو انہوں نے یہ تک بھی لکھ دیا ہے کہ وہ کسی ایسی عورت سے بھی واقف ہیں جو نمازوں کی امامت کے فرائض ادا کرتی تھی اور مرد اس کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے۔ افسوس کہ انہوں نے اس نادر روایت کا کوئی حوالہ نہیں دیا ورنہ ہم بھی قارئین کو اس کے منبع سے روشناس کراتے۔

مصنف نے جگہ جگہ دبی زبان سے یہ بھی بتایا ہے کہ جس زمانہ میں عورتیں نماز باجماعت ادا کیا کرتی تھیں اس وقت اس پردے کا اہتمام نہیں ہوتا تھا جو اب مسلمانوں میں رواج پا چکا ہے۔ یہاں پر ان کا یہ عمل ناقابلِ فہم ہے کہ انھوں نے اس بحث کو نظر انداز کر دیا ہے کہ پردہ کی آیات کے نزول کے بعد صحابہ کرامؓ نے مستورات کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا تھا؟

فلاح کے اصول بتلاتے ہوئے مصنف خدا کی ہستی، خدا کی وحی اور یوم آخرت پر ایمان کا ذکر کرتے ہیں۔ صفحہ ۱۰۹ پر اسلام کے تین اعتقادی اصول بیان کرتے ہوئے بھی انہوں نے انہی تینوں چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ تبصرہ نگار کے نزدیک اس بات میں ایک مغالطہ ہے۔ ثلثِ قرآن جس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے وہ ایمان بالرسالت ہے۔ اور ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت تینوں ستونوں پر اسلام کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ ایمان بالرسالت کی اصطلاح میں خدا کی وحی پر ایمان شامل ہے جب کہ وحی

پر ایمان کے الفاظ کہہ کر مصنف رسول کی شخصیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ رسول کی شخصیت کو نظر انداز کر کے دین کا جو حلیہ بگڑتا ہے تو اس کے نتیجہ میں قادیانیت یا پرویزیت کے پیدا ہونے کی گنجائش تو ہوتی ہے لیکن خالص اسلام پیدا نہیں ہو سکتا۔

جہاد کے باب میں مصنف نے جہاد کا وہی فلسفہ پیش کیا ہے جو قادیانیوں کا طرۂ امتیاز ہے یعنی وہ اسلامی جنگوں کو صرف دفاعی جنگیں سمجھتے ہیں اور اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لئے جہاد کرنے کے نظریہ کو خلافِ اسلام نظریہ بتاتے ہیں۔ یہ موضوع چونکہ اہم ہے اس لئے ہم مصنف کے دلائل کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

مصنف کے دلائل کا زیادہ تر انحصار دو آیتوں کے انطباق پر ہے۔ ایک سورۂ بقرہ کی آیت لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ اور دوسرے سورۂ توبہ کی آیت فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْھُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ (پھر جب عزت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں انہیں پاؤ) اول الذکر آیت سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام کی جبراً اشاعت ممنوع ہے اور اگر مسلمانوں کا فلسفہ جہاد تسلیم کر لیا جائے تو اس آیت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ دوسری آیت کو وہ ان مشرکین کے لئے خاص سمجھتے ہیں جن سے مسلمانوں کے معاہدے ہوئے تھے لیکن مشرکین نے ان معاہدوں کو توڑ دیا۔ اس عہد شکنی کے بعد مسلمانوں کو اپنے دفاع کے لئے جنگ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس جنگ کے خاتمہ کے لئے مشرکین کی طرف سے صلح کی درخواست کافی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا کہ اگر مشرک صلح کرنا چاہیں تو تمہارے لئے بھی صلح کرنا ضروری ہے (وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا) مصنف کے نزدیک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اسی پر رہا البتہ بعد میں مسلمانوں نے اور خاص طور پر ان کے فقہاء نے نہ منشائے الٰہی سمجھا اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے صحیح نتائج اخذ کر سکے۔ اس کے نتیجہ میں جہاد کے غلط تصورات مسلمانوں میں پھیلے اور یورپی مصنفین کو ان پر اعتراض کا موقع ملا۔

ہمارے نزدیک اس بحث کی بنیاد ہی مصنف نے غلط اٹھائی ہے۔ لَا اِکْرَاہَ

فی الدین کا مفہوم اس کی دوسری ہم معنی آیات کی طرح یہ ہے کہ اللہ تعالٰے نے لوگوں کے دین کے معاملہ میں کوئی فطری جبر نہیں رکھا۔ اگر وہ چاہتا تو سب کو مسلمان بنا دیتا لیکن یہ اس کی حکمت کے خلاف تھا۔ اب اس کی ہدایت دنیا میں آگئی ہے۔ گمراہی کے پردے چاک ہو چکے ہیں۔ اب ہر وہ شخص جو فطرت کی آواز پر لبیک کہے گا وہ اسلام کو اختیار کریگا۔ اس آیت کا اس بحث کے ساتھ کوئی تعلق نہیں کہ آیا دعوت کے کسی مرحلہ میں تلوار اٹھائی جاسکتی ہے یا نہیں؛ اس بحث کے لئے قرآن مجید کی دوسری آیات حدود مقرر کرتی ہیں

جہاں تک سورۂ توبہ کی آیت فاذا انسلخ الاشھر الحرم — الخ کا تعلق ہے، اس کا موقع و محل ہی مصنف نے غلط سمجھا ہے۔ اس سورہ کی پہلی دو آیات میں انہی مشرکین سے اعلانِ برأت کیا گیا ہے جنہوں نے معاہدات توڑ دیئے تھے۔ لیکن تیسری آیت میں یہ اعلانِ برأت تمام مشرکین کے لئے عام کر دیا گیا ہے اور صرف انہی قبائل کو اس سے مستثنٰی رکھا گیا ہے جو معاہدات کو نیک نیتی کے ساتھ نبھاتے رہے اور ان کا دامن مسلمانوں کے خلاف سازشوں سے داغدار نہیں تھا۔ ان مشرکین کو بھی ہمیشہ کے لئے مستثنٰی نہیں کیا بلکہ فرمایا کہ ان کے لئے یہ رعایت صرف اسی مدت تک ہے جس مدت تک ان کے ساتھ معاہدات ہو چکے ہیں۔ ان آیات میں مشرکین کے خلاف اعلانِ جنگ کا حکم بالکل دائمی ہے اور صلح کی درخواستوں کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ جنگ ختم ہونے کی واحد صورت یہ بتائی گئی ہے کہ مشرک ایمان لائیں اور نماز و زکوٰۃ قائم کرنے لگ جائیں۔

ان آیات پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے آیت نمبر ۳ کے اعلانِ برأت، معاہد مشرکین کے لئے اتموا الیھم عھدھم الی مدتھم کی پابندی اور فخلوا سبیلھم کی شرائط سے کلیتہً صرفِ نظر کیا ہے حالانکہ اس بحث میں یہی پہلو فیصلہ کن تھے۔

آگے کی وہ آیات جن میں مشرکین کے جرائم بتائے گئے ہیں (مثلاً نقضِ عہد، اخراج مسلمین وغیرہ) محض اظہارِ امر واقعہ کے طور پر ہیں۔ ان کے بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان جرائم کے مرتکب مشرکین ہی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا تھا درست نہیں۔ اس تفصیل سے یہ اندازہ ہوگا کہ مصنف نے قرآن مجید کی آیات کو بالکل غلط معنی پہنائے ہیں جس کے نتیجہ میں

ان کی یہ بحث ایک غلط نہج پر چل گئی ہے۔

مندرجہ بالا وضاحت کے بعد حدیث امرت ان اقاتل الناس ..... الخ سورۂ توبہ کی آیت ۵ کی تفسیر کرتی معلوم ہو گی حالانکہ مصنف نے اپنے نظریہ کو باقی رکھنے کے لئے یہ تک لکھ دیا ہے کہ :-

"اس حدیث کا مطلب ہرگز نہیں کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ لوگوں سے جنگ جاری رکھیں جب تک وہ اسلام قبول نہ کریں۔"

اس بحث میں مصنف ایک بنیادی امر کو ملحوظ نہیں رکھ سکے۔ قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرض منصبی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ دوسرے ادیان پر اسلام کو غالب کرینگے (هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ) اسلام کے اس غلبہ کے لئے آنحضورؐ کو جس طریقہ کی تعلیم دی گئی، اس میں ابتدائی مرحلہ دعوت کا تھا۔ اس مرحلہ میں صبر وثبات کے ساتھ کام کرنے کا حکم دیا گیا۔ ہجرت کے بعد حضورؐ کو اپنے دفاع کی اجازت ملی اور جب اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور ان مشرکین پر اتمام حجت ہو چکا جن کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے تو آپ کو ان کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اس حکم کے بعد آپ نے مکہ پر چڑھائی کی اور اسے فتح کیا۔ اسی غلبہ دین کے حکم ہی کی بنا پر آپ نے یہ ہدایت فرمائی کہ جزیرہ عرب میں کوئی مشرک باقی نہ رہنے پائے۔ مصنف نے یہ جو لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین نے مشرک قبائل کے ساتھ حمایت کے معاہدے کئے ہوئے تھے، اس کا ثبوت ہمیں تاریخ سے نہیں ملتا اور نہ ہی مصنف کا حاشیہ اس بیان کے حق میں ہے۔

اللہ کے دین کی اشاعت کے لئے تلوار کا استعمال خود منشائے الٰہی تھا اور خلفائے راشدین نے اسی منشاء کے مطابق دوسری قوموں کے سامنے اسلام، جزیہ یا تلوار کی شرائط پیش کیں۔ دعوتِ اسلام کے اس اختصار کی وجہ بھی یہی تھی کہ اب خدا کا دین غالب آ کر قائم ہو چکا تھا اور اس کی مزید وضاحت کی حاجت باقی نہ رہی تھی۔

مصنف فقیہہ کی بیان کردہ قتلِ مرتد کی سزا پر بھی چین بجبیں ہوئے ہیں اور یہاں بھی وہی بنیادی غلط فہمی کام کر رہی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم اس بحث اور چند دوسرے ضمنی مسائل کو نظر انداز کرتے ہیں۔

کتاب کی فصل سوم میں وضو، مسواک اور غسل و تیمم وغیرہ کا ذکر ہے لیکن مصنف نے اس پر عنوان "تزکیہ نفس" کا لگایا ہے۔ اس کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

کتاب کا ترجمہ رواں ہے۔ یہ مجلّد ہے اور بڑے سائز کے ۲۰۷ صفحات کو محیط ہے۔ اس کی قیمت کہیں درج نہیں کی گئی۔ (خ۔م)

---

(بقیہ صفحہ ۴)

لیکن اگر یہ حضرات اس حد تک جانے کے لئے تیار نہیں ہیں تو پھر سلامتی اسی میں ہے کہ جہاں تک جا چکے ہیں وہیں سے پیچھے مڑنے کی کوشش کریں اور کسی مفید کام میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کریں۔ اگرچہ اب اس نقصان کی تلافی تو نہیں ہو سکتی جو اسلام کے وقار کو اس ملک میں پہنچ چکا ہے، تاہم تجربہ سے فائدہ اٹھانا خیر سے خالی نہیں ہوگا۔

---

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

جلد | صفر، ربیع الاول ۱۳۸۲ھ | شمارہ ۱ و ۲

## فہرست مضامین



منیجر ماہنامہ میثاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تذکرہ و تبصرہ

سخت ندامت اور افسوس ہے کہ جولائی کا میثاق وقت پر شائع نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ راقم سطور جون کے آخر میں گردے کی تکالیف میں مبتلا ہو گیا۔ اور اب تک ان تکالیف کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے۔ یہ گردے کا عارضہ میرے پچھلے عوارض میں ایک نیا اضافہ ہے اور اس کا خاص اثر جو مجھ پر ہوا وہ یہ ہے کہ اس دوران میں لکھنے پڑھنے کا کام تقریباً بند رہا۔ میثاق کی ترتیب میں اگرچہ رفیق عزیز — خالد مسعود صاحب — حسبۃً للہ میرا ہاتھ بٹاتے ہیں لیکن ابھی وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ تنہا اپنی ذمہ داری پر اس کا کوئی شمارہ شائع کریں۔ اس صورت حال کی وجہ سے جولائی کا پرچہ مؤخر ہوتا گیا، یہاں تک کہ اگست کا مہینہ آ گیا۔ اب مزید تاخیر کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے پرچہ جوں توں مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں جو مضامین دیئے جا رہے ہیں ان پر میں نظر نہیں ڈال سکا ہوں۔ یہاں تک کہ تفسیر کے صفحات بھی مسودے سے نکال کر بغیر میری نظر ثانی ہی کے دے دیئے گئے ہیں۔ اس کوتاہی اور بے قاعدگی کے سبب سے رسالہ کے خریداروں کو جو شکایت ہوئی ہے وہ ایک بالکل قدرتی چیز ہے۔ اس کا احساس جتنا مجھے ہے شاید ہی کسی دوسرے شخص کو ہو۔ لیکن حالات پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسے اختیار حاصل ہے! میں رسالہ کی اشاعت کو منظم کرنے کے لئے ایک ایسے مددگار کی ضرورت شدت سے

محسوس کر رہا ہوں جو اپنا پورا وقت اس کے لئے دے سکیں۔ لیکن یہ بات اس وجہ سے ممکن نہ ہو سکی کہ پرچہ اب تک اپنے ناگزیر مصارف طباعت واشاعت بھی پورے کرنے کے قابل نہیں ہو سکا ہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے جو اس کے قدر دانوں کی توجہ کا محتاج ہے۔ اس پرچہ کو باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے قدر دان اس کا حلقہ اشاعت اپنے اپنے دائرہ اثر کے اندر کچھ بڑھانے کی کوشش کریں۔ اس کے بغیر اس قسم کے علمی و مذہبی پرچے کا جاری رہنا ممکن نہیں ہے۔

جولائی کے پرچہ کا جو نقصان اس کے خریداروں کو اٹھانا پڑا ہے اس کی تلافی انشاء اللہ اس ششماہی میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور کر دی جائے گی۔ یا تو ہر شمارے کا حجم بقدر ایک ایک کاپی کے بڑھا دیا جائے گا یا کسی ایک شمارے کا حجم دگنا کر دیا جائے گا۔

(۲)

نئے دستور کے نفاذ کے بعد سے اس ملک میں جو حالات پیش آئے ہیں وہ ہمارے نزدیک کسی پہلو سے بھی خوش آئند نہیں ہیں۔ اجتماعی و سیاسی زندگی میں ہمارے جو عناصر حصہ لیتے ہیں۔ ان میں سے بلا استثناء سبھی کا رول نہایت مایوس کن رہا ہے۔ جو لوگ اہل سیاست کے نام سے معروف ہیں انہوں نے اس دوران میں جس غیر ذمہ داری اور ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا ہے اور برابر دینے پر مصر ہیں اس سے ایک عام آدمی بھی اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ اس ملک میں جمہوریت کا مستقبل بہت تاریک ہے۔ ارباب اقتدار نے جو روش اختیار رکھی ہے اس سے ان توقعات کی قریباً کمر ٹوٹ گئی ہے جو صدر ریاست کی طرف سے از خود ایک دستور کے نفاذ اور مارشل لا کے ختم کئے جانے سے بہت سے دلوں میں پیدا ہو گئی تھیں۔ بالخصوص مشاورتی کونسل کی تشکیل جس شکل میں ہوئی ہے اس کو دیکھنے کے بعد تو ان حضرات سے اسلام کے باب میں کوئی اچھی توقع کرنا محض خوش فہمی ہی ہو گی۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس کونسل کی تشکیل کرتے وقت بہت دور تک سوچ کر اس بات کے لئے پیش بندی کی گئی ہے کہ مبادا اس کی وجہ سے ان کو اسلام کی کوئی بات قبول کرنے کی زحمت میں مبتلا ہو جانا پڑے۔ اگر یہ انتخاب صدر

ریاست کی اپنی ہی صواب دید پر مبنی ہے تو ہم اس پر ان کو مبارکباد نہیں دے سکتے ہیں
ان سے اس سے کہیں بہتر انتخاب کی امید تھی اور اگر اس انتخاب میں دوسروں کے مشورے
کو دخل ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے اس مشورے سے صدر ریاست کے وقار و اعتماد
اور ملک کے مستقبل کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ جو لوگ منتخب کیے گئے ہیں ہم ان شریف آدمیوں کو
زیر بحث لا کر بلا ضرورت ان کو مجروح نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پیش نظر
مقصد کے لئے ان میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کوئی شخص بھی اپنے اندر کوئی موزونیت نہیں
رکھتا۔۔ اس کونسل کے قیام سے مقصود بہر حال اسلام کے خلاف کوئی سازش کرنا نہیں
ہے بلکہ ملک کے سامنے پیش آنے والے پیچیدہ مسائل میں اس سے یہ فتویٰ حاصل کرنا ہے
ان مسائل میں اسلام کیا راہ نمائی دیتا ہے، اگر خوفِ خدا نہیں تو کم از کم دنیا کو دکھانے ہی
کے خیال سے اس میں کچھ ایسے لوگوں کو شامل کرنا ضروری تھا جو اس کام کے اہل ہوتے تاکہ
دستور کی اتنی اہم چیز جس سے نہ جانے کتنی امیدیں وابستہ تھیں لوگوں کی نظروں میں
بالکل مذاق بن کے نہ رہ جاتی۔ اپنے اس انتخاب کی تصویب میں محترم صدر ریاست اور
ہمارے وزیر خارجہ صاحب نے یہ جو فرمایا ہے کہ ایسے لوگ کہاں مل سکتے ہیں جن پر کسی کو
اعتراض نہ ہو یہ ایک بالکل ہی بادر ہوا بات ہے جو محض لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے
کہی جا رہی ہے۔ ورنہ آخر یہ مطالبہ کس نے کیا تھا کہ اس کونسل میں وہ لوگ لئے جاتے
جن پر کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔ لوگوں کا مطالبہ معصوم صفت انسانوں کے لئے نہیں تھا بلکہ ایسے
اشخاص کے لئے تھا جو اسلامی شریعت میں بصیرت رکھنے والے، حالات و مسائل کو سمجھنے والے
اور ملک کی اکثریت کے نزدیک قابلِ اعتماد ہوں۔ اگر اربابِ اقتدار کو اصل ضرورت کی اہمیت
اور مسلمانوں کے احساسات کا اندازہ ہوتا تو اس قوم کے اندر سے مذکورہ صفات کے اشخاص
کا تلاش کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ اب اگرچہ کوئی مشورہ پیش کرنا بعد از وقت ہے لیکن از روئے
دستور چونکہ اس فہرست میں اضافہ کی گنجائش موجود ہے اس وجہ سے ہم صدر ریاست کی خدمت
میں یہ عرض کریں گے کہ مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا داؤد غزنوی صاحب، مولانا مودودی
اور مولانا اظہر علی صاحب کو اس کونسل میں ضرور شامل کیا جائے۔ علماء کے طبقے سے جب تک

ان حضرات کے درجہ کے اشخاص نہیں لئے جائیں گے نہ تو کونسل کے اندر توازن قائم ہو سکے گا اور نہ مسلمانوں کی نظر میں اس کونسل کی اور اس کے مشوروں کی کوئی وقعت ہوگی۔

(۳)

اخبارات میں میرے اور میرے بعض دوستوں سے متعلق یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ ہم ستقبل قریب میں ایک مذہبی وسیاسی پارٹی کی تشکیل کے لئے اپنے ہم خیالوں کی ایک کنونشن یلا رہے ہیں۔ اس اطلاع کی بنا پر لوگ بکثرت خطوط کے ذریعہ سے بھی اس پارٹی کے متعلق ستفسار کر رہے ہیں اور قریب کے لوگ بالمشافہ گفتگو کے لئے بھی مجھ سے مل رہے ہیں۔ نمام مستفسرین کے خطوط کا الگ الگ جواب دینا چونکہ بہت مشکل ہے اس وجہ سے ان صفحات کے ذریعے سے اطلاع دی جاتی ہے کہ یہ خبر ہماری طرف سے اخبارات کو نہیں بھیجی گئی ہے۔ بلکہ یہ اے پی پی نے خود پھیلائی ہے اور یہ زیادہ تر اس کے اپنے ہی قیاسات اور اندازوں بنی ہے جس کے سبب سے اس میں صحیح اور غلط دونوں قسم کے اندازے شامل ہو گئے ہیں۔ س میں شبہ نہیں کہ کچھ احباب مجتمع ہوئے تھے اور انھوں نے ان تمام حالات ومسائل کا جائزہ بھی یا جن سے مارشل لا اٹھنے کے بعد ہماری قوم دوچار ہے۔ ہم میں سے اکثر نے اس خلا کو بھی بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا جو اس وقت ایک صحیح قسم کی دینی جماعت کے میدانِ عمل میں وجود نہ ہونے کی وجہ سے یہاں نمایاں ہے۔ اس سلسلہ میں میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ اس ملک میں جو لوگ اسلام کے لئے کام کرنے اٹھے تھے وہ اہلِ سیاست کے ہاتھوں میں بالکل کھلونا بن کے رہ گئے ہیں اور اہلِ سیاست کشمکش اقتدار کی جنگ میں ان کے نعروں اور ان کے مسائل و اپنے حریفوں کے خلاف اینٹ پتھر کے طور پر پوری بیدردی کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ صورتِ حال اسلام کے حق میں نہایت خطرناک ہے اہلِ دین جب دنیا طلبوں کے چکر میں پنس کر ان کی گاڑی کھینچنے لگتے ہیں تو پھر وہ دین کو بازیچۂ اطفال اور دنیا کی نگاہوں میں اس ایک مذاق بنا کے رکھ دیتے ہیں ــــ یہ صورتِ حال آج ہر صاحبِ نظر کے سامنے موجود ہے اور یہ ہمارے سامنے بھی موجود ہی ہے اور اسلام کے خدمت گزار ہونے کے پہلو سے ہم نے اس پر غور بھی کیا اور اس کا حل بھی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر شخص اندازہ کر

سکتا ہے کہ اس طرح کے اہم مسائل ہماری میں طے کرنے کے نہیں ہوتے۔ جماعتوں کی تنظیم نہ تو کوئی آسان کام ہے اور نہ اس وقت تک یہ مفید ہے۔ جب تک اس کے لئے کوئی شدید عملی ضرورت داعی نہ ہو۔ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ ہم نے جن مسائل پر غور کیا ہے، ان کے بارے میں کسی قطعی فیصلہ تک پہنچ چکے ہیں۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو ہم ضروری معلومات خود اجلاس کو فراہم کرتے۔ اس وجہ سے لوگ محض قیاسی اطلاعات کی بنا پر نہ تو کسی خوش گمانی میں مبتلا ہوں نہ کسی بدگمانی میں۔ اگر کسی جماعت کی تشکیل عمل میں آئی تو وہ بہر حال ملت کی کسی اہم ضرورت کی تکمیل کے لئے عمل میں آئے گی اور اسلام کی کوئی خدمت انجام دے گی۔ اس کے قیام سے مقصود نہ تو یہ ہو سکتا کہ قائم شدہ جماعتوں میں ایک اضافہ کیا جائے اور نہ کسی کی بے فائدہ مخالفت یا موافقت۔

(۴)

اخبارات سے یہ معلوم کر کے بڑا صدمہ ہوا کہ جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہاروی کا انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ مسلمانوں کی پوری قوم کے لئے ایک بڑا اہم حادثہ ہے۔ جو لوگ آج پاکستان کے گوشۂ امن و عافیت میں پہنچ کر بھارت کے اپنے چھ کروڑ مسلمان بھائیوں کو دلوں سے نکال بیٹھے ہیں وہ تو اس حادثے کی اہمیت کا کماحقہٗ اندازہ نہیں کر سکیں گے لیکن جو لوگ بھارت کے مسلمانوں کو بھولے نہیں ہیں اور انہیں اس مظلومیت کا بھی اندازہ ہے جس میں اس وقت ہمارے یہ بھائی مبتلا ہیں وہ کچھ اندازہ کر سکیں گے کہ مولانا مرحوم کی ذات ان کے لئے ان کے اس دورِ ابتلاء میں کتنا بڑا سہارا تھی۔ وہ فی الواقع ایک نڈر اور بہادر مسلمان تھے۔ انہوں نے تقسیم ملک کے بعد کے خطرناک حالات کا نہایت دانشمندی، نہایت بردباری، نہایت صبر و استقلال اور نہایت عزم و حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنی قوم کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ میرا ذاتی تاثر یہ تو ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بھارت کے مسلمانوں کی خدمت کی جو توفیق انہیں میسر آئی اس میں کوئی دوسرا مشکل ہی سے ان کے برابر ہو سکے گا۔ انہوں نے ملک کی مشترک جدوجہد آزادی میں جو نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس کی وجہ سے کانگریسی حلقوں پر ان کا خاصا اثر تھا۔ انہوں نے اپنے اس پورے

انگریز کو بالکل بے لاگ اور بالکل بے خوف ہو کر اپنی قوم کی حمایت و مدافعت میں صرف کیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے، پوری قوم کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ ایک زمانہ میں مولانا مرحوم کے ساتھ راقم کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ اب یہ تعلقات تو دوری کے سبب سے ختم ہو چکے تھے لیکن اس دور میں مسلمانوں کی جو خدمت وہ کر رہے تھے اس کے سبب سے ان کی محبت اور ان کی قدر و عزت دل میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے۔ اب یہ دعائے مغفرت ہی واحد سوغات ہے جو اس مجاہدِ ملت کے لئے اتنی دور سے ہم بھیج سکتے ہیں۔ ہم میثاق کے تمام قارئین سے بھی مولانا کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں۔

(۵)

علم قرآن کے چند شائقین کے اصرار پر میں نے قرآن مجید کے تحقیقی نوعیت کے درس کے لئے "حلقۂ تدبّر قرآن" کے نام سے ایک حلقہ قائم کر دیا ہے۔ خاص چیز جو اس حلقہ کے قیام کے لئے محرک ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ عمر تیزی کے ساتھ گزرتی جا رہی ہے اور میری تفسیر تدبر قرآن ابھی اپنے ابتدائی مراحل سے بھی آگے نہیں بڑھی ہے۔ نہیں معلوم پیش نظر نقشہ کے مطابق اس کی تکمیل کی فرصت ملتی ہے یا نہیں۔ یہ کام خاصا لمبا کام ہے۔ اس وجہ سے خیال ہوا کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک حلقۂ درس قائم کر کے کچھ ذہین و ذی استعداد طلبہ کو اس طرزِ فکر کی تربیت بھی دی جائے جو اس تفسیر میں اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ کا نام لے کر میں نے درس کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور چند طلبہ روزانہ پابندی کے ساتھ درس لے رہے ہیں۔ انگریزی اور عربی مدارس کے طلبہ میں سے جو طلبہ علم قرآن کا شوق رکھتے ہیں اور پابندی کے ساتھ اس کام کے لئے کچھ وقت نکال سکتے ہیں وہ اس حلقہ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ طلبہ کے علاوہ جو حضرات جدید یا قدیم تعلیم پائے ہوئے ہیں اور اس قسم کے کاموں کے لئے کچھ فرصت و فراغت رکھتے ہیں وہ اس حلقہ کے لئے سب سے زیادہ موزوں ثابت ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ پابندی اور التزام کے ساتھ اس کام کے لئے تھوڑا سا وقت روز نکال سکیں۔ جو حضرات اس حلقہ میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ عصر اور مغرب کے

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

# تفسیر سورۂ بقرہ

(۲۷)

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ ۔۔۔۔ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ | قواعد، قاعدہ کی جمع ہے۔ قاعدہ کے معنی بنیاد اور اساس کے ہیں۔ اوپر والی آیت میں اس گھر کی تعمیر کے حکم کا حوالہ تھا اب آگے یہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ اس کی بنیادیں اٹھاتے وقت حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ نے کیا دعا کی تھی اس گھر کے ساتھ ان کی کیا آرزوئیں اور تمنائیں وابستہ تھیں اور مستقبل میں اس سے کس فیض عام کے جاری ہونے کی انھوں نے اپنے پروردگار سے التجا کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت کا یہ حصہ صرف قرآن کے ذریعے سے ہمارے علم میں آیا ہے، اس لیے کہ یہود نے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، تورات سے خاص اس حصہ کو یا تو حذف کر دیا یا اس کو اپنے حسب منشا تحریف کر دی لیکن یہ آپ کی سرگزشت کا ایک ایسا ضروری حصہ ہے کہ اس کے بغیر یہ بالکل ناتمام معلوم ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ تحریف کردہ حصہ بے نقاب کر کے اس کی تکمیل کر دی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ اے ہمارے رب ہماری طرف سے قبول کر۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تیری عبادت اور تیری بندگی کی دعوت کے لیے یہ گھر جو ہم بنا رہے ہیں اس کو شرف قبولیت بخش اور ہماری یہ خدمت قبول فرما اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تیرے گھر کی بنیادیں اٹھاتے وقت کچھ التجائیں پیش کرتے ہیں، ہماری یہ التجائیں قبول فرما۔ ہم اس دوسرے مطلب کو ترجیح دیتے ہیں، اول تو اس وجہ سے کہ اس صورت میں یہ جملہ خاص خانہ کعبہ سے متعلق ہونے کے بجائے [illegible]

دعا کی تمہید بن جاتا ہے جو آگے آرہی ہے۔ دوسرے جہاں تک خانہ کعبہ کی تعمیر کا تعلق ہے یہ کام حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ، اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق کر رہے تھے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کی قبولیت پہلے سے معلوم تھی۔ انک انت السمیع العلیم میں خدا کی ان دو صفتوں کا حوالہ ہے جن پر اعتماد کر کے بندہ خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے اندر حصر کا جو مضمون ہے وہ دعا کرنے والوں کی طرف سے کامل سپردگی اور کامل اعتماد کا اظہار ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ ...... التَّوَّابُ الرَّحِيمُ | دعا کے بیچ بیچ میں بار بار "ربنا" کا اعادہ اور دعا کے مناسب صفاتِ الٰہی کا حوالہ دعا کے آداب میں سے ہے اس سے دعا شرفِ قبولیت حاصل کرتی ہے۔ یہ دعا ان دونوں چیزوں کے حکیمانہ استعمال کی بہترین مثال ہے۔

سب سے پہلے باپ بیٹے دونوں نے جس چیز کی دعا کی ہے وہ خود اپنے مسلم بنائے جانے کی ہے۔ مسلم کے معنی خدا کے کامل فرمانبردار کے ہیں۔ اس سے کئی حقیقتیں روشنی میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان و اسلام اور طلب ثبات و تقویٰ کی دعاؤں میں انسان سب سے پہلے اپنے آپ کو سامنے رکھے، یہ چیزیں ایسی نہیں جن سے کوئی بھی مستغنی ہو سکے اگرچہ وہ کتنا ہی عالی مقام پر ہو۔ دوسری یہ کہ اسلام کے درجات و مراتب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ جیسے مسلم کامل بھی جن کے ذریعہ سے دنیا اسلام کے نام اور اس کی روح سے آشنا ہوئی اپنے مسلم بنائے جانے کے لئے دعا کرتے تھے۔ تیسری حقیقت، جو خاص اس موقع سے تعلق رکھنے والی اور نظم کلام کو کھولنے والی ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تاریخی موقع پر جب کہ وہ اپنے مشن کا مرکز تعمیر کر رہے تھے اپنے لئے جس چیز کی دعا کی تھی، مسلم بنائے جانے کی تھی نہ کہ یہودی یا نصرانی بنائے جانے کی۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ۔ اپنے مسلم بنائے جانے کی دعا کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنی ذریت کے اندر سے ایک امت مسلمہ اٹھائے جانے کی بھی اس موقع پر دعا فرمائی۔ اس دعا میں چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کی ذریت میں سے حضرت اسمٰعیلؑ شریک تھے، اس وجہ سے اس کا واضح مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ یہ دعا انہی کی اولاد سے متعلق تھی چنانچہ انہی کی نسل کے اندر محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا اور آپ کی

دعوت ہے وہ امتِ مسلمہ ظہور میں آئی جس کے لیے یہ دعا کی گئی تھی۔ تورات سے یہ چیزیں بالکل غائب کر دی گئیں لیکن قربان ہونے والے فرزند سے متعلق یہ پیشگوئی موجود ہے کہ "تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی"۔

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۔ "اِرَاءَة" کے اصل معنی "ہمیں دکھا" کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنی شریعت کی طرف اپنے بندوں کی رہنمائی اس طرح کی وحی کے ذریعے بھی کرتا ہے جس کا مظہر قرآن مجید ہے اور کبھی رویا یا کشف میں براہِ راست یا کوئی فرشتہ بھیج کر اس کام کو عملاً دکھا یا بتا بھی دیتا ہے جو مطلوب ہوتا ہے۔ اس قسم کی رہنمائی قرآن مجید کی اصطلاح میں اِرَاءَت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء تشریف لائے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی رہنمائی زیادہ تر اِرَادَت ہی کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ یعنی یا تو رویا میں ان کو ایک بات دکھا دی جاتی تھی یا کوئی فرشتہ خداوندی ظاہر ہو کر مطلوب کام کی طرف راہنمائی کر دیتا تھا۔ تورات سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں دعا میں حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ نے اسی اِرادت کی درخواست کی ہے۔

مناسک، منسک کی جمع ہے۔ النسک کے اصل معنی دھونے اور پاک کرنے کے ہیں۔ نَسَکَ الثوب کے معنی ہیں کپڑے کو دھو کر پاک کیا۔ اسی سے نُسُک ہے جس کے معنی قربانی کے ہیں۔ قربانی بندے کو گناہ کی آلودگیوں اور آلائشوں سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ کا تقرب عطا کرتی ہے۔ پھر اسی سے منسک ہے جس کے معنی قربانی کے طریقہ کے بھی ہیں اور قربان گاہ کے بھی۔ اس کی جمع مناسک ہے جو حج کے تمام سلسلۂ عبادات و مراسم پر حاوی ہے۔ فرمایا ہے۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ ... ۲۰۰ بقرہ (جب تم حج کے مراسم ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو۔)

وَتُبْ عَلَيْنَا ۔ توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے اور متوجہ ہونے کے ہیں۔ اس کا صلہ جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو یہ جیسا کہ آیت ۳۷ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے اندر رحم کا مضمون پوشیدہ ہے۔ رحم کے اس پوشیدہ مضمون کو یہاں آگے اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ کہہ کر کھول بھی دیا ہے۔ بندہ جب اپنے رب کی طرف خشیت کے ساتھ رجوع کرتا ہے تو رب رحیم رحمت کے ساتھ بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ ..... اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجنا یعنی ہماری ذریت میں سے چونکہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ صرف حضرت اسمٰعیلؑ ہی تھے اور وہی اس وادیٔ غیر ذی زرع میں بسائے جا رہے تھے اس وجہ سے اس دعا کا تعلق لازمًا انہی کی ذریت سے تھا۔ اس کا کوئی تعلق بھی حضرت اسحٰقؑ کی ذریت سے نہیں ہو سکتا۔ تورات کے الفاظ سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ آخری نبیؐ کی بعثت حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ہونے والی تھی۔ استثنیہ باب ۱۸ میں حضرت موسٰیؑ کی جو مشہور پیشینگوئی ہے اس میں فرمایا ہے "تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا" آگے چل کر ہے "میں ان کے لئے انہیں کے بھائیوں میں سے" کے الفاظ صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسمٰعیل ہی ہیں اگر بنی اسرائیل مراد ہوتے تو صحیح تعبیر "انہی کے بھائیوں میں سے" کے بجائے "انہی میں سے" کی ہوتی اسی طرح "تیرے ہی بھائیوں میں سے" کی جگہ "تمہارے ہی اندر سے" کے الفاظ وارد ہوتے۔ علاوہ ازیں یہاں "میری مانند" کے الفاظ بھی قابل لحاظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نبی کی بعثت کی پیشینگوئی کی گئی تھی، ایک صاحب رسالت رسول کی تھی۔ قرآن مجید کی مذکورہ دعا میں اسی لحاظ سے رسول کا لفظ وارد ہوا ہے۔ ہم آگے کسی مناسب موقع سے رسول اور نبی کے فرق کو ظاہر کریں گے۔

یہاں جس رسول کی بعثت کے لئے دعا کی گئی ہے اس کے تین مقصد بتائے گئے ہیں۔ ایک تلاوت آیات، دوسرا تعلیم کتاب و حکمت، تیسرا تزکیہ۔

آیت لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جا سکے۔ اس پہلو سے آسمان و زمین کی ہر چیز آیت ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر چیز خدا کی قدرت و حکمت اور اس کی مختلف صفات خلق و تدبیر پر ایک دلیل ہے۔ اسی طرح وہ معجزات بھی آیت ہیں جو انبیاء علیہم السلام سے ظاہر ہوئے اس لئے کہ وہ بھی اپنے پیش کرنے والوں کی سچائی پر دلیل تھے۔ علیٰ ہٰذا القیاس قرآن مجید کے الگ الگ جملوں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لئے کہ فی الحقیقت ان میں سے ہر آیت کی حیثیت ایک دلیل و برہان کی ہے۔ جس سے خدا کی صفات اور اس کے احکام و قوانین اور اس کی مرضیات کا علم ہوتا ہے۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ کے الفاظ سے اس زور اور اختیار کا اظہار ہو رہا ہے جس سے مسلح

ہوا کہ خدا کا ایک رسول اس دنیا میں آتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ رسول محض ایک خوش الحان قاری کی طرح لوگوں کو قرآن سنانے نہیں آتا۔ بلکہ وہ خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے لوگوں کو آسمان و زمین کے خالق و مالک کے احکام و فرامین اور اس کے دلائل و براہین سے آگاہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وحی الٰہی کے لئے آیات کے لفظ سے اس حقیقت کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ خدا کا دین تحکّم اور جبر پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تمام تر دلائل و براہین پر مبنی ہے اور اس کے ہر ٹکڑے کے اندر اس کی دلیل ہے۔

اب آیئے تعلیم کتاب و حکمت کے الفاظ پر غور فرمایئے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ تعلیم تلاوت سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ تلاوتِ آیات تو یہ ہوئی کہ رسول نے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ خدا نے اس کے اوپر یہ وحی نازل کی ہے۔ تعلیم یہ ہے کہ نہایت شفقت و توجہ کے ساتھ ہر استعداد کے لوگوں کے لئے اس کی مشکلات کی وضاحت کی جائے، اس کے اجمالات کی تشریح کی جائے اس کے مقدرات کھولے جائیں اور اس کے مضمرات بیان کئے جائیں اور اس توضیح و بیان کے بعد بھی اگر لوگوں کے ذہن میں سوالات پیدا ہوں تو ان کے سوالوں کے جواب دیئے جائیں۔ مزید براں لوگوں کی ذہنی تربیت کے لئے خود ان کے سامنے سوالات رکھے جائیں اور ان کے جوابات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ لوگوں کے اندر فکر و تدبر کی صلاحیت اور کتاب الٰہی پر غور کرنے کی استعداد پوری طرح بیدار ہو جائے یہ ساری باتیں تعلیم کے ضروری اجزاء میں سے ہیں اور ہر شخص جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیا ہے اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ آپ نے اپنے صحابہؓ کے لئے تعلیم کتاب کے یہ تمام طریقے اختیار فرمائے۔

تعلیم کے ساتھ یہاں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک کتاب کا، دوسری حکمت کا۔

کتاب سے مراد تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے اس لفظ کی تحقیق ہم اس سورہ کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ لفظ حکمت کی تحقیق مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں جو بیان فرمائی ہے اس کا ضروری حصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"عربی میں حکمت تو وہ تعبیر ہے اس قوت و صلاحیت کی جس سے انسان معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرتا ہے حضرت داؤد کی تعریف میں ارشاد ہوا ہے وآتیناہ الحکمۃ

> وفصل الخطاب (ہم نے اس کو حکمت عطا کی اور فیصلۂ معاملات کی صلاحیت) یہاں فصل الخطاب کے لفظ سے اس اثر کو بیان کیا ہے جو حکمت کا ثمرہ ہے، جس طرح فیصلہ معاملات کی صلاحیت حکمت کے ثمرات میں سے ہے اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور تہذیب بھی اس کے ثمرات میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اہل عرب حکمت کا لفظ انسان کی اس قوت و صلاحیت کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں جو عقل و رائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کی جامع ہوتی ہے، چنانچہ دانشمند اور مہذّب آدمی کو حکیم کہا جاتا ہے اور جو بات عقل اور دل دونوں کے نزدیک بالکل واضح ہو اس کو حکمت سے تعبیر کرتے ہیں۔"

حکمت کا ذکر یہاں کتاب کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تعلیم حکمت تعلیم کتاب سے ایک زائد شے ہے، اگرچہ یہ حکمت سرتاسر قرآن حکیم ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں، ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ حکمت چونکہ حکیمانہ بات کو بھی کہتے ہیں اور حکیمانہ بات کہنے کی صلاحیت کو بھی۔ اس وجہ سے تعلیم حکمت کے معنی جس طرح کسی کو کوئی حکیمانہ بات بتا دینے کے ہیں اسی طرح اس کے معنی لوگوں کے اندر حکمت کی صفت و صلاحیت پیدا کرنے کے بھی ہیں۔

رسول کا تیسرا مقصد تزکیہ بتایا گیا ہے۔ لفظ تزکیہ دو معنوں پر مشتمل ہے۔ ایک پاک و صاف کرنے پر، دوسرے نشو و نما دینے پر، ہمارے نزدیک یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ جو چیز مخالف و مزاحم زوائد و مفاسد سے پاک ہو گی وہ لازماً اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان بھی چڑھے گی۔ انبیاء علیہم السلام نفوس انسانی کا جو تزکیہ کرتے ہیں اس میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں اور ان کے اعمال و اخلاق کو غلط چیزوں سے پاک صاف بھی کرتے ہیں۔ اور ان کے اعمال و اخلاق کو نشو و نما دے کر ان میں مفاسد اور مخالف و مزاحم چیزوں کے بالمقابل استقلال کے ساتھ سینہ سپر رہنے اور استقامت دکھانے کی قوت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کتاب کے مقابلہ میں نفوس کا تزکیہ کہیں زیادہ دیدہ ریزی، مشقت اور صبر و ریاضت کا طالب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کا ذکر تمام دین و شریعت کے غایت و مقصد کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت ہم

انشاء اللہ آگے کسی موزوں مقام پر کریں گے۔

آیت کے اجزاء کی وضاحت کے لئے یہ تفصیل بیان کافی ہے۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے تمام مقاصد نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں، اور مزید کسی تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے لیکن اس زمانہ میں منکرین حدیث نے رسالت کے ان تینوں مقاصد میں سے صرف ایک مقصد تلاوت آیات کو تو لے لیا ہے اور بقیہ دو کی نفی کر دی ہے۔ اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر مزید گفتگو کی جائے چنانچہ آگے مستقل عنوان سے ہم اس کے بعض دوسرے گوشوں پر بھی روشنی ڈالیں گے۔

آیت کے خاتمہ پر خدا کی دو صفتوں، عزیز اور حکیم ـــــ کا حوالہ ہے، عزیز کے معنی غالب اور عزت و قوت والے کے ہیں، یعنی وہ ذات جو پوری قوت و صولت اور پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ اس کائنات پر فرماں روائی کر رہی ہے۔ حکیم کے معنی ہیں جس کے ہر کام میں حکمت و مصلحت اور مقصد و غایت ہو، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفتوں کا حوالہ بالعموم ایک ساتھ آتا ہے۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات پر پوری قوت اور پورے غلبہ کے ساتھ حاوی اور متصرف ہے، لیکن اس کے اس غلبہ و اقتدار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کے زور میں جو چاہے کر ڈالے، بلکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت و مصلحت کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا کوئی کام بھی حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔

یہاں ان دونوں صفتوں کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جو خدا عزیز و حکیم ہے، اس کی عزت و حکمت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی اس خلقت میں اپنا سفیر اور پیغمبر بھیجے جو اس کی رعیت کو اس کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ ۔۔۔۔ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ | رَغِبَ، کا صلہ جب عَنْ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی چیز سے بے رغبت اور بیزار ہونے کے ہوتے ہیں۔

سَفِهَ زیادہ تر لازم آتا ہے، لیکن متعدی بھی آتا ہے۔ مثلاً سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنی ہوں گے اس نے اپنا نصیبہ بگاڑ لیا۔ سَفِهَ رَأْيَهٗ کے معنی ہوں گے اس نے احمقانہ رائے اختیار کی۔ اسی طرح

سَفِہَ نَفْسَہٗ کے معنی ہوں گے اس نے اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کیا۔

یہ اسلوب کلام اظہار تعجب اور اظہار افسوس دونوں کا جامع ہے۔ اشارہ یہاں یہود کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ ملت ابراہیمؑ کے پیرو ہونے کے مدعی ہیں، بلکہ اپنے زعم میں اس کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں، دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ جو پیغمبر ملت ابراہیمؑ کا داعی بن کر آیا ہے اس سے اور اس کی دعوت سے یہ سب سے زیادہ بیزار ہیں، وہ ان لوگوں کو بیوقوف قرار دے رہے ہیں جو اس دعوت کا ساتھ دے رہے ہیں۔ حماقت اور خرد باختگی کی اس سے بڑھ کر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ !

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا (اور ہم نے دنیا میں اس کو برگزیدہ ٹھہرایا) یہ اس برگزیدگی کی طرف اشارہ ہے جو ان کو دنیا کی قوموں کی سرداری و پیشوائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے بخشی اور جس کا ذکر اوپر آیت ۱۲۴ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے سب کی امامت کے لئے منتخب فرمایا احمق ہی ہو گا جو اس کی ملت کی پیروی سے اعراض اختیار کرے گا۔

صالحین کا لفظ قرآن مجید میں عام نیکوکاروں کیلئے بھی استعمال ہوا ہے اور اس پورے زمرے کیلئے بھی استعمال ہوا ہے، جو انبیاء، صدیقین، اور شہداء، اور صالحین سب پر مشتمل ہے اس آیت میں یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

---

مطالعہ حدیث

مولانا عبدالغفار حسن صاحب

# حدیث کے ظنی ہونے کا مفہوم

حدیث کی عظمت و اہمیت گھٹانے اور انکار سنت کی راہ ہموار کرنے کے لئے عموماً ان آیات و روایات کا سہارا لیا جاتا ہے جن میں "ظن" کی مذمت اور اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے ۔ ذیل کے مضمون میں "ظن" کی اصل حقیقت قرآن و سنت اور لغت عرب سے واضح کرتے ہوئے یقین و ظن کے لحاظ سے سنت و حدیث کا جو مقام ہے اس کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

( ع ۔ ح )

"ظن" کی مذمت میں مندرجہ ذیل آیات پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ۔ (حجرات ۱۲)

اے ایمان والو! گمان کی بہت سی قسموں سے بچو۔

(۲) إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ۔ (النجم ۲۳)

وہ مشرکین صرف "ظن" اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے ہدایت آچکی ہے

(۳) إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (یونس ۶۶)

وہ نہیں پیروی کرتے مگر گمان کی، وہ اٹکل سے کام لیتے ہیں۔

(۴) وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ

ان میں سے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں ۔ بلاشبہ ظن حق سے کچھ بھی

شیئا۔ (یونس ۳۶) نہیں کرتا۔

(۵) وَ قَالُوا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ، اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (جاثیہ ۲۴)

اور کہا انہوں نے نہیں وہ مگر دنیاوی زندگی۔ ہم مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں۔ اور ہمیں ہلاک نہیں کرتا مگر زمانہ، اور ان کو اس کا کچھ بھی علم نہیں، وہ تو صرف ظن و تخمین میں مبتلا ہیں۔

(۶) اِنْ نَظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ۔ (جاثیہ ۳۲)

ہم صرف گمان ہی کرتے ہیں اور ہم یقین نہیں رکھتے۔

(۷) وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ (بنی اسرائیل ۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہیں اس کے پیچھے مت پڑو۔

ان آیات کے علاوہ بخاری و مسلم کی مندرجہ ذیل حدیث کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔

اِيَّاكُمْ وَ الظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ،

ظن سے بچو، بیشک "ظن" سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

## "ظن" کی اصل حقیقت

مذکورہ بالا آیات اور حدیث میں "ظن" کے مفہوم کو متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اصل حقیقت کو لغت عرب اور قرآن حکیم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

امام راغب کہتے ہیں۔

الظن اسم لما يحصل من امارة ومتیٰ قويت ادت الی العلم و متیٰ ضعفت جدا لم يتجاوز حد التوهم۔

مفردات راغب ص۳۱۹

علامات و قرائن سے جو شے حاصل ہو اسے ظن کہا جاتا ہے۔ اگر یہ علامات و قرائن قوی ہوتے ہیں تو ظن کی سرحد علم و یقین سے مل جاتی ہے اور اگر یہ قرائن بہت ہی زیادہ کمزور ہوں تو پھر انتہائی درجہ وہم ہے۔

یعنی علامات و قرائن کی قوت و ضعف کے لحاظ سے ظن کے درجات و مراتب مختلف

حاشیہ۔

## ظن کے مراتب و اقسام

(۱) کسی شئے کے وجود یا عدم پر قرائن و علامات انتہائی قوی اور شکوک و شبہات سے بالاتر ہوں تو ظن کی یہ شکل یقین کے ہم معنیٰ ہے۔ قرآن مجید میں ظن بمعنیٰ یقین متعدد جگہ استعمال ہوا ہے۔

(الف) الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (بقرہ ۴۶)

جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

(ب) قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (بقرہ ۲۴۹)

ان لوگوں نے جو اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں کہا کتنے ایسے گروہ تھے جو قلت تعداد کے باوجود کثیر التعداد گروہ پر اللہ کے حکم سے غالب آ گئے۔

ان آیات میں ظن بمعنیٰ یقین یا قریب بہ یقین مراد لینے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قرآن مجید نے مومنوں کی ایک نمایاں صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا وبالاخرۃ ہم یوقنون واضح رہے کہ آخرت اور لقاء رب کا مفہوم ایک ہی ہے۔

(۲) ظن کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ کسی شئے کے وجود یا عدم پر سو فیصدی قرائن موجود نہ ہوں بلکہ اس سے کم ہوں مثلاً ۶۰ فیصد اور اس سے زیادہ۔ اس کو اردو میں گمانِ غالب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے ظن پر اعتماد و اعتبار نہ صرف یہ کہ پسندیدہ ہے بلکہ بعض حالات میں ضروری اور واجب ہے۔ ظن کا یہ مفہوم ذیل کی آیات میں ملتا ہے۔

(الف) لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا۔ (نور)

کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم نے اس (بہتان) کو سنا مومن مردوں اور مومن عورتوں کے بارے میں تم اچھا گمان کرتے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو تلقین کی جا رہی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کے بارے میں حسن ظن (خوش گمانی) سے کیوں نہ کام لیا، کیونکہ زیادہ قرائن و علامات اسی بات کے

حق میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کا دامن اس قسم کی تہمت سے پاک ہے۔

(ب) فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ۔ (بقرہ ۲۳۰)

دونوں میاں بیوی پہ کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ آپس میں رجوع کر لیں اگر انکو یہ گمان ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم کر سکیں گے۔

طلاق رجعی کی شکل میں میاں بیوی سے کہا جا رہا ہے کہ اگر دونوں اپنے حالات اور قرائن کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم کرنے پر آمادہ ہوں اور اس کے لئے گمان غالب کی حد تک روشن امکانات موجود ہوں تو میاں بیوی اپنا گھر آباد کر سکتے ہیں۔

(۳) ظن بمعنیٰ شک، یعنی کسی چیز کے وجود اور عدم پر یکساں قرائن و علامات موجود ہوں دونوں میں سے کسی ایک کے قرائن کو ترجیح دینا ناممکن ہو۔ مثلاً ارشاد ربانی ہے۔

وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا۔ نساء

اور بلاشبہ جن لوگوں نے اس (عیسیٰ علیہ السلام) کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ اس کی جانب سے شک میں ہیں ان کے پاس اس کے بارے میں کوئی علم ویقین نہیں ہے۔ سوائے ظن کی پیروی کے اور انہوں نے یقیناً قتل نہیں کیا۔

اس آیت میں یہود کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے سلسلے میں ان کے اقوال و آراء کی بنیاد شک پر ہے، علم ویقین پر نہیں ہے۔ اسی شک اور عدم علم ویقین کو اتباعِ ظن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ظن بمعنیٰ شک استعمال ہوا ہے۔

شک کے مفہوم کی وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو مفردات راغب صـ۲۶۶ الشک اعتدال النقیضین عند الانسان وتساویھما وذالک قد یکون لوجود امارتین متساویتین عند النقیضین او لعدم الامارۃ منھما۔

(۴) ظن بمعنیٰ وھم یعنی ایسا خیال وگمان جس کی بنیاد کسی دلیل پر نہ ہو بلکہ واضح نص اس کے خلاف موجود ہو۔

مضمون کے شروع میں جن آیات کو نقل کیا گیا ہے ان میں اسی قسم کے بے بنیاد وہم و خیال کی مذمت کی گئی ہے۔ اور حدیث میں اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۵) ظن بمعنیٰ تہمت، جیساکہ ایک قرأت میں ہے۔ وما ہو علی الغیب بظنین۔ سورۂ تکویر بیان ظنین، متہم کے معنیٰ میں ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں ظن کی تیسری، چوتھی اور پانچویں قسم مذموم اور قابلِ اجتناب ہیں اور اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے ملتی جلتی ہیں۔ مذکورہ بالا زیر بحث آیات پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آیت نمبر (۱) میں فرمایا گیا ہے کہ گمان کی بہت سی قسموں سے بچو، معلوم ہوا کہ گمان (ظن) کی ہر شکل قابلِ مذمت نہیں ہے، اس لئے بعد میں ارشاد ہوا۔

ان بعض الظن اثم      بلاشبہ گمان کی بعض صورتیں گناہ ہیں۔

آیات (۲۔۳۔۴) میں مشرکین کے عقیدہ شرک اور ان کے مشرکانہ اقوال اور رسم ورواج کو بیان کیا گیا ہے اور آخر میں ان کے عقائد کی بنیاد ظن وتخمین کو قرار دیا گیا ہے، یعنی ان کے ان عقائد ورسوم کی پشت پر کوئی قابلِ اعتماد دلیل موجود نہیں ہے حالانکہ اس کے برعکس شرک کی تردید اور توحید کے اثبات میں نہایت قوی عقلی اور کائناتی دلائل وقرائن موجود ہیں۔

آیت (۵) میں حشر ونشر کے انکار کو "ظن" یعنی بے بنیاد وہم قرار دیا گیا ہے کیونکہ حشر ونشر (زندگی بعد موت) کا ثبوت متعدد عقلی اور نقلی دلائل وبراہین سے واضح ہو چکا ہے۔ اس کا انکار کسی یقین اور علمی استدلال پر مبنی نہیں ہے۔

آیت (۶) میں مشرکین کا مقولہ نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے قیامت کا انکار کرتے ہوئے کہا تھا، آیت (۷) میں ان باتوں کے پیچھے پڑنے اور ان کے بارے میں زبان کھولنے سے منع کیا گیا ہے۔ جن کی بنیاد وہم وخیال پر ہو اس لحاظ سے یہ آیت، آیت نمبر ا کے ہم معنیٰ ہے۔ اسی طرح حدیث "ایاکم والظن" میں اس "ظن" سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو شکی اور وہمی مزاج کی پیداوار ہو۔

"ظن" کے یہ مراتب واقسام اسی طرح ہیں، جس طرح کہ "یقین" کے متعدد مراتب واقسام قرآن مجید سے معلوم ہوتے ہیں۔

**مراتب یقین** | قرآن مجید میں یقین کے تین مراتب و منازل بیان کئے گئے ہیں۔ علم الیقین عین الیقین اور حق الیقین۔

امام ابن تیمیہؒ نے ان تینوں مراتب کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "علم الیقین" علم کے اس درجہ کا نام ہے جو کسی شخص کو کسی بات سننے، کسی دوسرے شخص کے بتلانے اور کسی امر میں قیاس اور غور و فکر کرنے سے حاصل ہو۔ پھر جب اسے آنکھوں سے مشاہدہ اور معائنہ کرے گا تو اسے عین الیقین کا مرتبہ حاصل ہو جائیگا اور جب دیکھنے کے بعد اسے چھوئیگا، محسوس کریگا، اُسے چکھیگا اور اس کی حقیقت کو پہچان لے گا تو اسے حق الیقین کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ علم الیقین کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص نے خبر دی کہ فلاں مقام پر شہد ہے اب راوی پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی تصدیق کرنا علم الیقین ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ خود آنکھوں سے شہد کے چھتے کا مشاہدہ کر لیا جائے یہ عین الیقین کا مرتبہ ہے یہ درجہ پہلے مرتبہ کی بہ نسبت اعلیٰ اور یقین و اذعان کے لحاظ سے اونچا مقام رکھتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ لیس المخبر کالمعائن، یعنی جو کان سے سن لے وہ اس کے برابر نہیں ہو سکتا جو آنکھ سے دیکھ لے۔ حق الیقین کی مثال یہ ہے کہ کسی نے شہد کو چکھ کر اس کا مزہ اور اس کی مٹھاس محسوس کر لی۔ یہ تیسرا درجہ دوسرے درجہ کی نسبت ارفع و اعلیٰ ہے۔

اب یوں سمجھنا چاہیئے کہ جہاں سے یقین کا ابتدائی درجہ شروع ہوتا ہے وہاں ظن کی اعلیٰ ترین قسم کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ یقین سے یہ تینوں مراتب درجہ بدرجہ شریعت اسلامیہ میں مطلوب ہیں۔ لیکن "ظن" کی مذکورہ بالا پانچ اقسام میں سے دو یعنی ظن بمعنی یقین اور ظن بمعنی گمان غالب مستحسن نہیں بلکہ بعض حالات میں ان پر اعتماد کرنا واجب ہے۔ باقی رہیں آخری تین قسمیں تو ان سے احتراز و اجتناب ضروری ہے۔ اصولِ حدیث کی کتابوں میں حدیث کو ظنی یا مفید کہا گیا ہے۔ اس سے مراد ظن کے پہلے یا دوسرے معنیٰ ہو سکتے ہیں نہ کہ تیسرے اور چوتھے معنیٰ۔

واضح رہے کہ گمان غالب کے لحاظ سے مفید ظن روایات کو اخبار آحاد کہا جاتا ہے یعنی ایسی حدیث جن کے راوی تعداد کے اعتبار سے حد تواتر کو نہ پہنچے ہوں۔

خبر متواتر اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی ہر دور میں اتنے زیادہ رہے ہوں کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر متفق ہو جانا ناممکن ہو۔

اب یقین کے مختلف مراتب اور ظن کی متعدد صورتوں کے اعتبار سے حدیث کی حسب ذیل اقسام ہیں۔

(۱) ایسے عملی مسائل پر مشتمل احادیث جو امت میں شروع سے اب تک بغیر کسی اختلاف کے ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً اذان و اقامت کے کلمات، صبح کی دو رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں، اور عصر کی چار رکعتیں، رکوع و سجود کی تعداد، اس قسم کے بیسیوں وہ امور ہیں جو حدیث کی مستند کتابوں میں درج نہیں اور ان کی تائید میں پوری امت کا تعامل (عمل در آمد) بغیر کسی شائبہ اختلاف کے موجود ہے۔ سنت و حدیث کا یہ وہ سرمایہ ہے جس کا یقینی پہلو قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کی طرح محکم اور مضبوط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے کاتبوں اور حافظوں کی تعداد اگر ہر دور میں لاکھوں رہی ہوگی، تو نمازیوں اور روزہ رکھنے والوں کی گنتی کروڑوں سے کم نہ ہوگی۔ تواتر اور راویوں کی ان گنت تعداد کے لحاظ سے حدیث کا یہ سرمایہ قرآن ہی کی طرح یقینی ہے۔ اس کا انکار خود قرآن کے انکار کے ہم معنیٰ ہے۔

حدیث کا یہ سرمایہ شک و شبہ سے بالاتر ہونے کے اعتبار سے حق الیقین کا مقام رکھتا ہے۔

(۲) تواتر کی دوسری قسم علم کی اصطلاح میں تواتر طبقہ عن الطبقہ کہلاتی ہے۔ یعنی ایک دور کے ان گنت افراد دوسرے اور بے شمار لوگوں کی طرف کامل اتفاق کے ساتھ کسی بات کو منتقل کرتے ہیں۔ اس کی واضح مثال قرآن مجید کا ایک دور سے دوسرے دور کی طرف تواتر کے ساتھ منتقل ہونا ہے۔ یہ قسم بھی حق الیقین کے درجہ میں ہے۔

(۳) تواتر اسناد۔ یعنی حدیث کا ایک متن متعدد سندوں سے مروی ہو، یہ تعداد بھی اتنی ہو کہ حد تواتر تک پہنچ جائے۔ مثلاً حدیث من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار (یعنی جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے)

یہ روایت ۶۲ صحابہ سے منقول ہے جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ ایک دوسری تحقیق کے مطابق صحابہ کی تعداد ستر سے بھی متجاوز ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ ابن اصلاح ص۱۳۵

اسی طرح ختم نبوت پر احادیث ۱۵۰ صحابہ سے مروی ہیں جن میں سے تیس ۳۰ صحابہ کے اسمائے گرامی صحاح ستہ میں ملتے ہیں۔ مقدمہ فتح الملہم شرح مسلم ص۶

(۴) تواتر قدر مشترک یا تواتر معنوی۔ یعنی کسی واقعہ کے بارے میں منقول تمام جزئیات و تفصیلات تو حدِ تواتر کو نہیں پہونچتیں لیکن مختلف روایات میں جو قدر مشترک پایا جاتا ہے اس کے متواتر ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا، مثلاً حاتم طائی کی سخاوت کے بارے میں جو تفصیلات زبان زد عوام ہیں وہ سب کی سب متواتر نہیں ہیں، لیکن ان سب حکایات و واقعات میں ایک بات قدر مشترک کی حیثیت سے پائی جاتی ہے اور وہ ہے حاتم کی بے پناہ جود و سخا۔ اس کا انکار بداہت کے انکار کا ہم معنیٰ ہے سنت کے مستند ذخیرے میں اس تواتر کی نمایاں مثال احادیث معجزات ہیں۔ یہ روایات اپنی سند اور راویوں کی تعداد کے لحاظ سے متواتر کی حد سے کم ہیں لیکن ان میں جو قدر مشترک پایا جاتا ہے اس کے متواتر ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان احادیث میں یہ بات قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض ایسے افعال کا صدور ہوا ہے جو خارق عادت اور سلسلہ اسباب سے ماوراء ہیں۔

حدیث کی اقسام (۳، ۴) سے یقین و اطمینان کی وہی کیفیت حاصل ہوتی ہے جو عین الیقین" سے حاصل ہو سکتی ہے۔

حدیث متواتر کی ان اقسام کے بعد خبر واحد کا نمبر آتا ہے۔ راویوں کی تعداد اور ان کی ہمت کے لحاظ سے اس کی بھی بہت سی قسمیں ہیں ان میں سے بعض اقسام مفید یقین ہیں یعنی ان سے علم الیقین کی سی اطمینانی کیفیت حاصل ہوتی ہے) اور بعض انواع مفید ظن ہیں یعنی گمان غالب کی حد تک انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ (باقی)

افادات فراہی

از جناب خالد مسعود صاحب

# اصولِ تفسیر

اس مضمون کی دو قسطیں جو پہلے شائع ہوئی ہیں نظمِ کلام کے نظری پہلو واضح کرتی ہیں۔ اس قسط میں عملی پہلو پیش کیا گیا ہے اس لئے ان لوگوں کے لئے اس مضمون کا مدعا سمجھنا مشکل ہوگا جنہوں نے قرآن کا بغور مطالعہ نہیں کیا ہے اور جو نظم کی مشکلات سے واقف نہیں (ادارہ)

## نظام اور مناسبت میں فرق

بعض علماء نے آیات اور سورتوں کی باہمی مناسبت کے باب میں کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ لیکن نظم قرآن کے باب خاص میں کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ میرے نزدیک نظام اور مناسبت دونوں میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ مناسبت نظام کا محض ایک حصہ ہوتی ہے کیونکہ آیات کی باہمی مناسبت کلام کے بارے میں کوئی مستقل بالذات چیز واضح نہیں کرتی۔ ایک ایسا شخص جو محض مناسبت کا متلاشی ہو وہ آیات کی کسی ایسی مناسبت پر بھی قناعت کر سکتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ اول تا آخر پورے کلام کو منظم کرنے والی مناسبت سے غافل ہو جائے۔ ایسا شخص پاس پاس کی ان دو آیتوں میں بھی نسبت تلاش کرنے لگے گا جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو بلکہ ان میں سے ایک آیت کسی سابقہ سلسلہ بیان سے متعلق ہو۔ قرآن مجید میں اس طرح کے مواقع بے شمار ہیں۔ ان مواقع پر بڑے ذہین لوگوں کو بھی آیات کی نسبت معلوم کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔

نظم سے ہماری مراد سورہ کے اجزا کی وہ باہمی نسبت ہے جس کے نتیجہ میں پوری سورہ ایک وحدت میں ڈھل جائے۔ اس کا تعلق ان سورتوں کے ساتھ معلوم ہو جائے جو اس کے پہلے یا بعد میں کچھ فاصلے پر واقع ہیں (کیونکہ عین ممکن ہے کہ جس طرح ا

آیات جملہ معترضہ کی حیثیت سے آجاتی ہیں اسی طرح بعض سورتیں بھی معترضہ سورتیں بن کر آئی ہوں اتظم معلوم ہوجانے کے بعد اول سے آخر تک پورا قرآن مناسبت وترتیب رکھنے والا کلام معلوم ہوگا۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ نظام محض مناسبت یا محض ترتیب اجزا سے الگ ایک چیز ہے

**وحدانیت** ہر منظم کلام کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے۔ جس کی طرف پورا کلام لوٹتا ہے۔ اس لئے نظام وہی قابل قبول ہو سکتا ہے جو پوری سورہ کو ایک وحدت عطا کرے اور اس کے تمام اجزاء ایک خاص مرکزی مضمون سے مربوط ہو جائیں۔

وحدانیت، مناسبت اور ترتیب کے پہلو سے کلام کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ایک کلام وحدانیت رکھتے ہوئے بھی تناسب و ترتیب سے خالی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک کتاب پند و نصائح کی جامع ہے اس میں دین و اخلاق اور معاشرت و سیاست کے متعلق متعدد اقوال بغیر کسی ترتیب کے جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ کتاب گو وحدانیت سے خالی نہیں ہوگی (اس کی وحدانیت کمزور سہی) کیونکہ یہ تمام تر پند و نصائح کے باب میں ہے لیکن اس کے باوجود اسمیں تناسب و ترتیب کا فقدان ہوگا۔ اب اس کتاب کے اقوال کو دین و اخلاق وغیرہ کے الگ الگ ابواب میں تقسیم کر کے کتاب تصنیف کر دو تو گو اس کتاب میں تناسب ہوگا لیکن وحدانیت حسب سابق کمزور رہے گی۔ انہی نصائح کو کلیلہ و دمنہ کے نہج پر ایک جامع قصہ کی شکل میں جمع کر دو تو مجموعی طور پر اگرچہ یہ تصنیف کمزور وحدت رکھتی ہوگی لیکن الگ الگ اس کے ہر باب میں وحدت پائی جائے گی۔ پند و نصائح کے اسی مواد کو جب حسن ترتیب اور مناسبت کے ساتھ ابواب میں تقسیم کروگے اور کلام کو اس طرح مرتب کروگے کہ یہ تمام کا تمام ایک خاص موضوع سے متعلق ہو جائے اور اس کے تمام اجزا میں باہمی مناسبت پیدا ہو جائے تو اب یہ کتاب کامل نظام رکھنے والی ہوگی۔ گویا کلام کے حسن ترتیب اور حسن تناسب کے ساتھ ساتھ ایک مضبوط وحدانیت بھی حسن نظام کی ایک ضروری شرط ہے۔

**عمود کی خصوصیات اور اس کی تعیین** نظام اور وحدانیت رکھنے والے ہر کلام کا ایک عمود ہوتا ہے۔ یہ پورے خطاب کے تمام مطالب کا جامع اور کلام کا مقصود و مطلوب اور حاصل ہوتا ہے۔ عمود، کلام کی ترتیب کا کوئی جزو نہیں ہوتا

بلکہ یہ اس میں شرح کی طرح جاری و ساری ہوتا ہے۔ یہ ایک منطقی نتیجہ اور مرکزی مضمون ہوتا ہے جس کی شرح و تفصیل اور دلیل کلام کی ایک ایک سطر پیش کرتی ہے۔ عمود کا اختصار لمبا اور واضح اچھا ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معلوم کرنے کے لئے کلام پر گہرے فکر و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے ٹھیک ٹھیک واقف ہونے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی نظم کلام میں غور کرے، جملوں کے در و بست کو پہچانے اور کلام کے مطالب کا اچھی طرح احاطہ کرے۔ اس غور فکر کے بعد جو عمود سمجھ میں آئے، اس کی روشنی میں دیکھئے کہ مزید تفصیل میں جانے کے بعد بھی حسن نظام ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر نظام کے ساتھ یہ مفروضہ عمود ٹھیک بیٹھ جائے تو اسے اختیار کرے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اسے ترک کر کے دوسرا عمود تلاش کرے۔

عمود کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سورہ کے اندر اپنی حقیقت کے اعتبار سے سب سے عظیم الشان بات ہو۔ اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں کہ ایک سورہ کی تمام آیتیں یکساں اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں۔ ان میں سے بعض آیتیں اپنے گرد و پیش کی آیات سے بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ ایسی آیات پر خاص طور پر غور کرنا چاہیئے، ان کے محاسن و مطالب کی وضاحت کرنی چاہیئے اور نظائر سے ان کی دلالت کو واضح کرنا چاہیئے تاکہ لوگ ان پر اندھے بہرے ہو کر نہ گریں۔ عمود سے ہماری مراد اس طرح کی عظیم الشان آیتیں نہیں ہیں۔ عمود کے لئے عظیم الشان بات نہیں بلکہ سب سے زیادہ جامع بات ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ سورہ کے تمام مطالب کے لئے شیرازہ کا کام دیتا ہے۔ ہاں بیان کے لحاظ سے وہ سورہ کے اندر سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ نور کے اندر آیت اللّٰہ نور السمٰوٰتِ والارض.... الخ کو لیجئے۔ یہ کس طرح آفتاب تاباں بن کر چمک رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سورہ کے اندر عمود کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ایک بالکل ضمنی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کا عورتوں سے متعلق حسنِ ادب کی تعلیم ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ یہ سورہ عورتوں کو پڑھائی جائے تاکہ وہ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کو معلوم کر سکیں۔

سورتوں کی اس طرح کی عظیم الشان آیات لغت، اعراب، بلاغت، تاریخ، فقہ، حکمت وغیرہ مختلف پہلوؤں سے نمایاں ہوتی ہیں۔ جس طرح ایک ٹیلے پر جلتی ہوئی آگ کی طرف آدمی

متوجہ ہو جاتا ہے، اسی طرح ان آیات کی طرف عمود کا ہر متلاشی پہلی ہی نظر میں متوجہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب نظم کلام معلوم کرنے کی غرض سے آدمی آیات میں تدبر کرتا ہے اور سیاق و سباق کی دلالتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اس وقت ان نمایاں آیات کے بجائے بعض دوسری آیات ابھر آتی ہیں جو دوسرے پہلو سے عظیم الشان ہوتی ہیں۔

عمود ہر سورہ کا ایک ہی ہوتا ہے لیکن یہی ایک بسا اوقات بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ مثلاً سورہ حجرات کے عمود کو لو۔ ہے یہ ایک ہی بات۔ گو لغت میں ہم اس کے لئے ایک ہی جامع لفظ نہ پا سکیں۔ تعبیر مطلب کے لئے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سورہ میں بدخلقی پر ملامت اور جھڑکی ہے، عام اس سے کہ وہ بدخلقی خیال سے تعلق رکھتی ہے یا قول سے یا عمل سے۔ چنانچہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گفتگو میں سبقت، آپ کی آواز پر آواز بلند کرنے، عام آدمیوں کی طرح آپ کو پکارنے، بے ضرورت اور بے موقع آپ کو زحمت دینے اور کسی فاسق کی اطلاع پر کسی قوم پر ٹوٹ پڑنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ پھر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اصلاح، ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت اور ان کے درمیان عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے ساتھ تمسخر سے، ان کی عیب جوئی سے، تنابز بالالقاب سے، بدگمانی سے، تجسس سے، غیبت سے، غرور سے، ادعائے پارسائی سے اور پھر سب سے آخر میں سب سے بدترین شے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے اسلام کا احسان دھرنے سے روکا گیا ہے۔

## عمود کی تلاش مشکل کیوں ہے؟

سورہ کے عمود کی تعیین اگرچہ اس کے نظام کی معرفت کی کنجی ہے، لیکن ہے یہ انتہائی مشکل کام، اس کے لئے بڑے تدبر، چھان پھٹک اور آگے پیچھے کی ہم مضمون سورتوں پر اس وقت تک غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جب تک کہ عمود آفتاب کی مانند چمکنے نہ لگے، اس سے سورہ کا ایک ایک گوشہ روشن نہ ہو جائے اور ہر آیت کا موقع و محل اور اس کی راجح تاویل متعین نہ ہو جائے۔ عمود کی تلاش کا یہ کام بوجوہ مشکل ہے، ان میں سے چند اہم وجوہات کا ہم بیان ذکر کریں گے۔

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید متشابہ و مثانی نازل ہوا ہے۔ اس میں کئی سورتیں متشابہ مطالب کی حامل ہوتے ہوئے مختلف عمود رکھتی ہیں یا اس کے برعکس ان کے مضامین غیر متشابہ ہیں لیکن

عمود ایک ہی ہے۔ جب تک آدمی ان سورتوں کے مضامین میں غور کر کے راجح عمود نکال نہیں لیتا اس وقت تک اس کی حالت اس مسافر کی ہوتی ہے جو چوراہے میں کھڑا ہو اور جس راستہ پر چلی جائے وہ اپنی منزل سے دور ہوتا چلا جائے۔

دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا نے قرآن کو جس طرح عقائد و شرائع کے واجبات کی تعلیم کے لئے نازل فرمایا اسی طرح اس کا ایک مقصد تعلیم حکمت بھی رکھا ہے۔ یہ تعلیم حکمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں سے تھی، اسی لئے آپ کو خیر العلمین بنایا اور وہ آیات عطا فرمائیں جو کمال تعلیم ہیں۔ تعلیم حکمت کا یہ اصول ہے کہ یہ معارف کے القاء سے نہیں بلکہ فکر و عقل کے اس حد تک استعمال سے حاصل ہوتی ہے جس سے آدمی کی پوشیدہ قوتیں ظاہر ہو جائیں۔ چنانچہ جس طرح ہر تربیت کا اصول ہے قرآن کو ایک پہلو سے ظاہر و واضح بنایا لیکن دوسرے پہلو سے اسے باطن اور سربستہ راز رکھا تاکہ لوگ اپنی اپنی ہمت و کوشش کے مطابق اس کے باطن کے مدارج پر ترقی کرتے جائیں۔ قرآن مجید کا نظام غور و فکر کا حاصل ہے اور عمود بالکل مخفی۔ اگر سورتوں کے عمود واضح کر دیے جاتے تو نظام سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوتی، لیکن اس طرح قرآن تعلیم حکمت کی غرض کو پورا نہ کرتا۔ عقلوں کی آزمائش ہی کی خاطر اللہ تعالےٰ نے عمود کو ثریا کی بلندی پر رکھ چھوڑا ہے۔

تیسری وجہ عمود کے مشکل ہونے کی یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مندرجہ بالا مقصد ہی سے قرآن مجید کو غایت درجہ مختصر بنایا لیکن اسے حکمتوں سے معمور کر دیا۔ اس کے عالی مضامین اور گراں قدر مطالب کی بنا پر ایک قاری متحیر ہو جاتا ہے۔ یکساں اہمیت کی چیزوں میں سے اس کے لئے ایک عمود کا انتخاب اسی طرح مشکل ہو جاتا ہے جس طرح بہت سارے عمدہ جواہر کی موجودگی میں یہ فیصلہ مشکل ہوتا ہے کہ ان میں سے کس کو ترجیح دے کر اسے ہار کے وسط میں جگہ دی جائے۔

**نظام کا تعلق تاریخ سے** مختلف واقعات کے نظم کے جو متعدد پہلو ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک پہلو زمانے کا قرب بھی ہے۔ مثلاً جو حوادث ایک زمانے کے واقعات اسی پہلو سے منظم ہیں اور ایک دوسرے سے جدا کر نہیں

آتے۔ اسی طرح ہجرت کے موقع یا اس کے بعد کے واقعات ہیں، پھر مدینہ کی ریاست یا فتح مکہ اور اس کے بعد کے زمانہ کے مسائل ہیں۔ یہ سب معلوم و مشہور اور نمایاں ہیں۔ اسی زمانی بنیاد پر علمائے سلف نے مکی و مدنی سورتوں کی تقسیم کی ہے یا بعض کی آیات کو مدنی یا مدنی آیات کو مکی کہا ہے۔ انہوں نے اس سے زیادہ تقسیم نہیں کی۔ اگر انہی کے اصول پر مزید غور کیا جائے تو ابتدائی دعوت، قبیل ہجرت یا فتح مکہ کے زمانہ کی آیات بھی پوشیدہ نہیں رہتیں۔ البتہ ایک زیادہ مخفی پہلو پھر بھی باقی رہ جاتا ہے اور وہ مستقبل سے متعلق آیات کا نظم ہے۔ قرآن میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ اس امت کو مستقبل میں کیا حالات درپیش ہوں گے اور انہیں کس چیز کی حاجت ہو گی۔ صحابہ ان اشارات سے واقف تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان اشارات کے مصداق بتایا کرتے تھے۔

**موقع کلام اور نظام** ایک اور چیز جو فہم نظام میں مدد دیتی ہے، موقع کلام کا تعین ہے۔ موقع کلام میں ظاہر یا مخفی اس کی دلالت موجود ہوتی ہے۔ مثلاً سورۂ اعلیٰ کی آیت سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى کا نظم اس کے موقعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور اس موقعہ کی دلالت سے آدمی اس وقت واقف ہوتا ہے جب تسبیح کے مواقع جان لے: تسبیح کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تو اس موقع پر دیا جاتا جب آپ اپنی تعلیم کا اثر دیکھتے اور صحابہ کے اندر مطلوبہ صفات کا مشاہدہ فرماتے۔ اس موقع پر آپ کے لئے شکر و حمد واجب تھا۔ لہذا آپؐ کو تسبیح کا حکم ہوتا۔ مثلاً سورہ نصر میں یا مندرجہ ذیل آیت میں ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۔ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ (الشعراء، ۲۱۷-۲۱۹)

اور خدائے غالب و دانا پر توکل کر جو تم کو دیکھتا ہے جب تم اٹھتے ہو اور نمازیوں میں تمہارے پھرنے کو بھی دیکھتا ہے۔

اسی بنا پر حضورؐ کو اس وقت بھی تسبیح کا حکم دیا جاتا جب آپؐ صحابہ کو نماز پڑھتے، انفاق کرتے اور آپؐ کی نصیحت سے فائدہ اٹھاتے دیکھتے۔ جیسا کہ صحابہ کی یہ صفت بیان ہوئی کہ۔

كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ

ایک کھیتی کی مانند جس نے اپنا کونپل نکالی

فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (فتح ۲۹)

پھر اس کو مضبوط کیا، پھر موٹی ہوئی۔ اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے۔

تسبیح نماز کے حکم کا دوسرا موقع وہ تھا جب جھٹلانے والوں کی مخالفت کے نتیجہ میں آپ کو ملال ہوتا۔ یہ موقع صبر و ثبات، تسلی، استراحت اور اپنے ساتھیوں کی طرف رجوع کرنے کا ہوتا۔ متعدد سورتوں میں اس موقع کی آیات آئی ہیں۔ سورہ اعلیٰ کے نزول کے زمانہ میں یہ دونوں حالتیں جمع ہو گئیں۔ چنانچہ یہاں تم دونوں گروہوں ــــ موافقین و مخالفین ــــ کا ذکر پاؤ گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر اس بات کا غلبہ تھا کہ مکذبین کو چھوڑ کر تلاوت قرآن اور نماز کو اختیار کریں۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے شکر کی تسبیح کرتے خدا سے مدد طلب کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نصیحت کے کام کو جاری رکھنے کا بھی حکم دیا۔ فرمایا کہ وہی ہادی اور کارساز ہے جو تمہاری دعوت کو مفید بنائے گا اور تمہارا کام آسان کرے گا۔ وہی ہے جو مخلوق کو اس کی تقدیر کی طرف لے جاتا ہے۔ بعض لوگ تمہاری دعوت سے نصیحت حاصل کریں گے، دوسرے اس سے پہلو تہی کریں گے۔ تم خدا کے شکر گزار ہو کر کام کئے جاؤ اور مخالفوں کی مخالفت کو خاطر میں نہ لاؤ۔ فرمایا:

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰی

پس یاد دہانی کرو اگر یاد دہانی فائدہ کرے۔

یعنی نہ ان کے پیچھے پڑو اور نہ انہیں بالکل ترک کر دو کیونکہ یہ اپنے اپنے حالات کے مطابق ہدایت یا محرومی اور فلاح یا بدبختی کی راہ اختیار کریں گے۔

## فہم نظام میں تمہید کا لحاظ

جس طرح نحوی اعتبار سے ایک جملہ کے اجزائے ترکیبی، مبتدا و خبر، فعل و فاعل اور مفعول و حال وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح ایک کلام کے بھی اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ اجمالی طور پر یہ چار اجزا ہوتے ہیں ــــ عمود، تمہید، نفس مضمون اور خاتمہ۔

جہاں تک تمہید کا تعلق ہے، کلام کے شروع میں اسے لانے کی ضرورت عموماً اس وقت [illegible] مشکل ہو گا۔ لہٰذا اصل مقصود

کے لئے اس کو تیار کرنے کی خاطر تمہیدی بیان پہلے لایا جاتا ہے۔ اگرچہ تمہید کی بنیادی ضرورت یہی ہے لیکن کلام میں اس کے بے شمار دوسرے پہلو بھی ہیں۔ اس کی مقدار بھی مختلف ہو سکتی ہے اور اس سے فائدے بھی ان گنت حاصل کئے جاتے ہیں۔

تمہید کو اتنا طویل کرنا کہ وہ مقصود کلام کے بیشتر حصہ پر چھا جائے، پسندیدہ نہیں۔ لیکن ایک ماہر متکلم کلام کے مختلف طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ وہ بات کو اس طریقہ سے پھیر لے جائیگا جس کا مخاطبین کو سان گمان بھی نہ ہوگا۔ کبھی وہ تمہید کو طویل کرکے یا تو اپنا مقصود موزوں عبارت میں کہہ دے گا یا اسی تمہید کو اصل بات کہنے کا ذریعہ بنائے گا۔ اور کبھی وہ تمہید سے اصل مضمون کی طرف بتدریج آئے گا لیکن کلام کی تفصیل نہیں کرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر مخاطب مطیع و منقاد ہے تو وہ تمہید کو ترک ہی کر دے یا اگر قہر و غضب کی حالت میں کوئی حکم دے تو مخاطب پر بجلی کی سی کڑک کے ساتھ ٹوٹ پڑے ان مواقع کی مثالیں تم سورۂ نور یا سورہ توبہ میں دیکھو گے یا پھر ان مواقع پر دیکھو گے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خطاب کیا گیا ہے۔

مقالات

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

# اسلام اور انسانی حقوق

(۳)

**تقلید کی ممانعت** جس طرح اسلام نے غور و فکر کی تعلیم اس لئے دی ہے تاکہ انسان سوچ بچار کے بعد صحیح راستہ اختیار کرے اسی طرح وہ تقلید اور ذہنی غلامی یعنی غور و فکر سے کام نہ لینے کو سخت ناپسند کرتا ہے اس کے نزدیک تمام خرابیوں اور برائیوں کا یہی سرچشمہ ہے۔ اسی مہلک مرض کا شکار ہو کر آدمی کفر و شرک، ضلالت و گمراہی اور زوال و ادبار کے عمیق غار میں گر جاتا ہے۔ ایجاد و ترقی کی راہ کا سب سے بڑا روڑہ یہی ہے۔ اس سے تحقیق و اجتہاد ترقی و انکشاف اور ایجاد و اختراع کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ تقلید کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے دل و دماغ کو کند ، مفلوج اور ذہن و فکر کو ماؤف و معقل کر دے اور صحیح و غلط کی تمیز کے بغیر صرف اسی پر اکتفا کرے جو اس کے آباؤ اجداد یا قدیم رسم و رواج سے اسے ملا ہے۔ دنیا کی زندہ قومیں جو ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوتی ہیں ہمیشہ تقلید سے پرہیز کرتی اور غور فکر اور عقل و بصیرت سے کام لیتی ہیں۔ لیکن مردہ قومیں تقلید کا سہارا لیتی ہیں اور کامرانی کی منزل سے دور ہوتی جاتی ہیں۔

قومے بجد و جہد گرفتند وصل دوست قومے دگر حوالہ بتقدیر می کنند

اقبال کو بھی اسی لئے بجا طور پر شکوہ ہے

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

حقیقت یہ ہے کہ تقلید اور قدیم رسم و رواج کی غلط محبت سے زیادہ خطرناک اور مہلک کوئی چیز نہیں اسی لئے اسلام نے اسے بڑی گمراہی قرار دیا ہے۔ کفر و شرک اور ضلالت کا اصلی سبب یہی ہے کہ آدمی نہ اپنی جگہ سے ہٹنے کے لئے تیار ہوتا ہے اور نہ اپنے غلط افکار و اعمال ترک

پر ایک لمحہ کے لئے نظر ثانی کرنا چاہتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم الہلال میں تقلید کو انسانی ضلالت کا اصل مبداء قرار دیتے ہوئے کیا خوب تحریر فرماتے ہیں۔

" ہر اصلاحی تحریک و دعوت کے لئے پہلی منزل تقلید کی بندشوں کو توڑنا ہے۔ کیونکہ تقلید کے اہرمن سے بڑھ کر انسان کی تمام یزدانی خصائل کا اور کوئی دشمن نہیں، انسانی اعمال کی جس قدر گمراہیاں ہیں ان سب کی تخم ریزی صرف تقلید ہی کی زمین میں ہوتی ہے اس لئے راہ اصلاح کا اولین منظریہ ہے کہ تقلید پرستی کے سلاسل و اغلال سے انسان کو نجات حاصل ہو۔ خدا تعالٰے نے ہر انسانی دماغ کو سوچنے والا اور ہر آنکھ کو دیکھنے والا بنایا ہے۔ ۔ ۔ ۔ تقلید سے پہلی ہلاکت جو انسانی دماغ پر چھا جاتی ہے وہ یہی ہے کہ انسان اپنے چند پیشواؤں اور مقتداؤں کی تعلیم یا آباؤ اجداد کے طریق و رسوم پر اپنے آپ کو چھوڑ دیتا ہے اور صرف انہیں کا تعبد کرتے کرتے خود اپنی قوتوں سے کام لینے کی عادت کو بھول جاتا ہے۔ اس عالم میں پہنچ کر اس کی حالت بالکل ایک چوپائے کی سی ہو جاتی ہے اور انسانی ادراک و تعقل کی تمام علامتیں مفقود ہونے لگتی ہیں۔ انسان کا اصلی شرف نوعی اور مابہ الامتیاز اس کے دماغ کا تدبر و تفکر اور اجتہاد و تجسس ہے سو دنیا میں جس قدر علوم و فنون کا انکشاف ہوا، قوانین الہیہ اور نوامیس فطریہ کے چہروں سے جس قدر پردے اٹھے، اشیاء کائنات کے خواص کا جو کچھ سراغ لگا، تمدن و مصنوعات میں جس درجہ ترقیاں ہوئیں، نئے نئے آلے اور نئے نئے وسائل راحت جس قدر ایجاد ہوئے، غرضیکہ انسان کے ارتقائے ذہنی و فکری کے جس قدر کرشمے دنیا میں نظر آ رہے ہیں، یہ تمام تر اسی انسانی تفکر و تدبر کے نتائج ہیں، لیکن تقلید پرستی کی عادت ہلاکت و بربادی کی ایک چٹان ہے جو انسانی تفکر و تدبر اور ادراک و تعقل کی تمام قوتوں کو کچل ڈالتی ہے اور اس کی قوت نشوونما کا دائمی سدباب کر دیتی ہے۔ قرآن کریم جس دعوت کو لے کر آیا فی الحقیقت اس کا اصلی مقصد یہی تھا کہ تقلید اور استبداد فکری کی زنجیروں سے انسان کو نجات دلائے۔ بت پرستی اور انسان پرستی کی تمام شاخیں بھی اسی تقلید آباء و رسوم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن نے اپنی تعلیم توحید کا اساس بھی انسان کی اجتہاد فکری پر رکھا اور تفکر پر زور دیا۔ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالہا، مقلدین محض کو چارپایوں اور حیوانوں سے تشبیہ دی اور پھر اس کو بھی اظہار ضلالت کے لئے ناکافی قرار دے کر ان سے بھی بدتر فرمایا "

اور یہ بالکل صحیح ہے کہ حق و صداقت سے بعد، خدا پرستی سے انحراف اور ضلالت و گمراہی میں پڑ جانے کا واحد سبب یہی ہوا ہے کہ لوگوں نے رسم و رواج اور آباؤ اجداد کی غلط اور اندھی پیروی کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ انبیاء و رسل کی تکذیب و استہزاء کے پس پردہ یہی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ جب بھی خدا کے پیغمبروں نے راہِ راست کی طرف بلایا اور عقل و فکر سے کام لینے پر زور دیا تو مقلدین اور مسلکِ آباء و اجداد کے شیفتگان نے عقل، فہم اور تجربہ کے واضح اور صریح فیصلوں کے خلاف یہی دلیل دی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (زخرف ۲۳)

اور ایسے ہی ہم نے تم سے پہلے بھی جب کسی ڈرانے والے کو کسی بستی میں بھیجا تو وہاں خوشحال لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم ان کے آثار کی تقلید کر رہے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنی قوم کی بت پرستی کے خلاف نکیر کرتے ہوئے فرمایا:

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (انبیاء ۵۲)

یہ کیسی تصویریں ہیں جن کے آگے تم جھکتے ہو۔

تو انہیں جواب ملا۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ (انبیاء ۵۳)

انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے باپ دادا کو انہیں کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔

قیامت میں گم کردہ راہ لوگ اپنی ضلالت و گمراہی پر نادم و شرمندہ ہونے کے ساتھ ہی یہ عذر لنگ بھی پیش کریں گے کہ،

اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (الاحزاب ۶۷)

ہم نے اپنے اکابر اور لیڈروں کی بات مانی پس انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔

مسلمانوں کی موجودہ فکری و عملی گمراہی اور علم و فن میں ان کا روز بروز انحطاط بھی ان کے جمود و تعطل اور فکر و تحقیق سے بیگانگی کا نتیجہ ہے۔ مولانا ابوالکلام نے ترجمان القرآن میں اس پر ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ ذوق ختم ہو گیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہو گئی۔ اس داء عضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لئے قدم اٹھاتا کسی پیشرو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی ہجری میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو ضروری ہے کہ وہ نویں صدی کی تفسیروں تک برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے کسی نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ چند لمحوں کے لئے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کر لے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے۔ رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہو گئیں کہ کسی متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بیضاوی اور جلالین کے حاشیوں کو دیکھو کہ ایک بنے ہوئے مکان کی لیپ پوت کرنے میں کس طرح قوت تصنیف رائگاں گئی ہے۔ دیباچہ جلد اول صفحہ ۱۶

قرآن مجید کی بنیاد تمام تر عقل پر ہے۔ یہ مسلمات اور ثابت شدہ حقائق کو بھی بیان کرتا ہے تو دلائل اور شواہد کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ توحید، رسالت اور معاد کا تذکرہ اس میں جملہ وجوہ و علل کے ساتھ ہوا ہے۔ نجات و سعادت کی راہیں بتائی گئی ہیں تو ان کے اسباب و دلائل کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس دین حق کی تبلیغ و ہدایت فرما رہے تھے اسے آپ نے پوری بصیرت، کمال اطمینان اور نہایت شرح صدر کے بعد اختیار کیا تھا۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف) قرآن مجید کفار و مشرکین کے شرک و بت پرستی، یہود و نصاریٰ کی ضلالت اور حق پرستی سے دیدہ و دانستہ انحراف اور دوسرے مذاہب اور فرقوں کی عام گمراہیوں کے خلاف آواز اٹھاتا اور ان کے عقائد فاسدہ اور افکار باطلہ کا رد کرتا ہے تو برہان و استدلال سے کرتا ہے۔ وہ اسلام کی حقانیت اور قرآن کی صداقت کو بھی زبردستی اور دھاندلی سے نہیں منواتا۔ لیکن اگر واضح دلائل اور صریح شہادتوں کے بعد کوئی قلب ایمان کا لذت شناس نہیں ہوتا اور اس کی چشم مست کو سراج منیر کی روشنی نظر نہیں آتی اور نہ اس کے کانوں میں صدائے حق کی دلکشی گھر کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ضدی اور ہٹ دھرم ہے اور اس نے اپنی قوت فکر و عمل اور صلاحیت ادراک و تعقل کو مفلوج کر دیا ہے اس لئے اس میں اور چوپایوں میں کوئی فرق نہیں بلکہ وہ ان سے بھی بدتر

اسلام کی وہ راہ ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (اعراف ۱۷۹)

اور ہم نے دوزخ کے لئے اکثر جن و انس پیدا کئے جن کے دل ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں۔ آنکھیں ہیں تو ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح سے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ اور یہی لوگ دراصل غافل اور بے خبر ہیں۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہو گا۔ کہ قرآن مجید کو انسان کی آزادیٔ فکر کا کس درجہ خیال ہے اور وہ اسے کسی حال میں پسند نہیں کرتا کہ آدمی اپنی عقل و فہم کو استعمال کرنے میں کوئی دقیقہ باقی رکھے اور تقلید کا سہارا لے۔

## رسول اکرمؐ بھی داعیٔ فکر و نظر تھے

جس طرح قرآن مجید سراپا دعوتِ فکر و نظر ہے اسی طرح اس کا حامل اور شارحؐ بھی عقلِ انسانی کا مربی اور اسے فقہ و اجتہاد اور استدلال و بصیرت کی بہترین صلاحیت بخشنے والا اور غور و خوض اور فکر و نظر کی اہمیت بتانے والا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اسالیب سے فقہ و تعقل کی دعوت دی ہے، فرمایا: من یرد اللہ بہ خیرا یفقہ فی الدین (جس کے ساتھ خدا بھلا کرنا چاہتا ہے اسے فقہ و اجتہاد کی صلاحیت بخشتا ہے) ایک مرتبہ آپ نے لوگوں سے فقہ و بصیرت اور دین و حکمت کی باتیں سیکھنے اور دوسروں کو سکھانے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا۔ فرب حامل فقہ الی من ھو افقہ منہ (یعنی سمجھ کی بات کے بعض متحملین اسے اپنے سے زیادہ سمجھ دار کے حوالہ کرتے ہیں۔

بعض اوقات آپؐ صحابہؓ سے مخفی امور کی مناسبتیں دریافت کرتے اور اس قسم کے سوالات کرتے تھے جن سے ان کا دماغ غور و فکر کا عادی بنے چنانچہ ایک مرتبہ دریافت فرمایا کہ "درختوں میں کونسا درخت مومن سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے" آپؐ نے عبادت و ریاضت کے کاموں کو سوچ سمجھ کر ادا کرنے کی تاکید کی۔ فرمایا:۔

الا لا خیر فی عبادۃ لیس فیھا تفقہ ولا علم لیس فیھا تفھم ولا قراءۃ لیس فیھا تدبیر۔ آگاہ رہو کہ جس عبادت میں سمجھ اور جس علم میں فہم اور جس پڑھنے میں تدبیر شامل نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

حضرت معاذؓ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ اگر تمہارے پاس کوئی معاملہ فیصلہ کے لئے آئیگا تو کیا کروگے؟ انہوں نے جواب دیا کہ کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کرونگا۔ آپ نے پوچھا اگر اس میں اس مسئلہ کا حل نہ ملا تو کیا کروگے؟ جواب دیا۔ خدا کے رسول کی سنت میں اسے تلاش کروں گا۔ آپ نے پوچھا اگر سنت سے بھی وہ مسئلہ حل نہ ہوا تو؟ حضرت معاذؓ نے کہا۔ اجتھد برائی ولا آلو (اپنی فہم اور سوجھ بوجھ کے مطابق اجتہاد کروں گا اور پوری کوشش و کاوش سے کام لوں گا۔) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ جواب بہت پسند آیا اور آپ نے نہایت مسرور ہو کر فرمایا۔ الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضاہ ( اس خدا کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے ایلچی کو اس بات کی توفیق دی جو اسے پسند ہے )

قرآن مجید کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی لوگوں کے سامنے مسلمات، حقائق، حج براہین اور دلائل و شواہد رکھتے تھے تاکہ وہ کامل غور و فکر کے بعد کوئی راہ اختیار کریں اگر دین کی دعوت پر لبیک کہیں تو اس لئے کہ ان کی عقل کو بھی وہ اپیل کر رہی ہو، اگر اسلام قبول کریں تو اس لئے کہ یہی ان کے دل کی آواز ہو، خیر کی طرف ان کا رجحان اس لئے ہو کہ ان کا ضمیر اس کا مطالبہ کرے۔ برائی سے نفرت کریں تو اس لئے کہ ان کا شعور بھی اس سے نفرت کر رہا ہو۔ شرک و ظلم سے پرہیز کریں تو اس لئے کہ ان کا ادراک و تعقل انہیں اس سے پرہیز کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔ غرضیکہ رد و قبول اور ترک و اختیار کے ہر معاملہ میں خود ان کا دل اور ان کی عقل پورے طور سے مطمئن ہو۔ اسی مفہوم کو آپ نے اپنے جامع الفاظ میں اس طرح ادا فرمایا ہے :-

| | |
|---|---|
| لا یکن احدکم امعۃ یقول انا مع الناس | تم میں سے کوئی شخص طفیلی بن کر یہ نہ کہے گا کہ میں |
| ان احسن الناس احسنت، وان اساؤا | لوگوں کے ساتھ ہوں اگر وہ اچھا کام کریں گے تو |
| اسأت ولکن وطنوا انفسکم ان احسن | میں بھی اچھا کروں گا اور اگر برائی کریں گے تو میں بھی برائی |

اس ان تحسنوا و ان اساءوا ان تجتنبوا اساءتهم

کرونگا، بلکہ تمہیں اس بات کا عادی بننا چاہیئے کہ اگر لوگ اچھا کریںگے تو تم بھی اچھا کرو اور اگر وہ برا کریں تو تمہیں ان کے برے سے بچنا چاہیئے۔

اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق کی تلاش میں اگر آدمی کی فکر و تحقیق اگر غلط بھی ہو جائے تو اس پر بھی آدمی کو ایک اجر ملے گا۔ باقی رہے وہ لوگ جنکا اجتہاد درست ہوتا ہے ان کے لئے دوہرا اجر رکھا گیا ہے۔ علم کی تحصیل پر بھی اس لئے زور دیا گیا ہے کہ اس سے غور و فکر، استدلال و استنباط اور نظر و بصیرت کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ علم اگر صحیح ہے تو اس سے صحیح فکر پیدا ہوگا اور اس طرح حقیقت حال تک رسائی اور خدا کی معرفت و خشیت حاصل ہوگی۔

غور فرمائیے قرآن کا حامل و شارح کس طرح فکر و نظر کی دعوت دیتا اور عقل انسانی کی تربیت کرتا ہے۔ اس کا منشا انسان کے فکر و خیال کی آزادی نہیں تو کیا ہے؟

**صحابہ اور آزادئ فکر** جن لوگوں کو رسول کریمؐ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ہے اور آپ نے ان کی عقلی و ذہنی تربیت فرمائی ہے۔ ان کے ارشادات سے بھی عقل و فہم سے کام لینے کی اہمیت اور اس کے بالمقابل تقلید اور پابندی رسم و رواج کی شناعت ظاہر ہوتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور قرآن کی روح سمجھنے والوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کو مکمل اسوہ اور نمونہ بنانے والوں کے نزدیک بھی انسان کی آزادئ فکر کی بہت اہمیت ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے صرف اس قدر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ خلفائے راشدین کبھی اپنی ذاتی رائے اور فیصلہ کو کسی پر ٹھونپنا نہیں چاہتے تھے بلکہ تمام امور و مسائل اور مہمات میں عام صحابہ سے مشورہ کے بعد ہی کوئی فیصلہ صادر کرتے تھے۔

یوں بھی اس زمانہ میں آدمی کا فکر جس طرف اس کی رہنمائی کرتا تھا، انفرادی طور پر وہ اسی پر عمل کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور قاضی شریح کو خطوط لکھے تو ان میں انہیں فقہ، بصیرت اور اجتہاد و تفکر سے کام لینے کی تلقین کی۔ ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام جو خط لکھا تھا اس کے یہ الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں۔

| | |
|---|---|
| واعرف الاشباه والامثال وقس الامور | (اشیاء کے مابین مناسبتوں اور مشابہتوں کو سمجھو اور معاملات و امور میں درست اندازہ لگاؤ۔ |

حضرت علیؓ سے مروی ہے:

| | |
|---|---|
| ایاکم والاستنان بالرجال | لوگوں کی تقلید اور نقل سے بچو۔ |

مشہور فقیہ اور جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے:

| | |
|---|---|
| الا لا یقلدن احدکم دینہ رجلا ان آمن آمن وان کفر کفر فانہ لا اسوۃ فی الشر۔ | خبردار! تم میں سے کوئی شخص اپنے دین کے معاملہ میں کسی کی تقلید نہ کرے کہ اگر وہ ایمان لائے تو میں بھی ایمان لاؤں گا اور اگر وہ انکار کرے تو میں بھی انکار کروں گا کیونکہ شر میں تقلید درست نہیں۔ |

ایک بزرگ عبداللہ بن معتمر کا ارشاد ہے۔

| | |
|---|---|
| لافرق بین بھیمۃ تنقاد و انسان یقلد[1] | مطیع اور باگ میں لگے ہوئے چوپائے اور مقلد انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ |

ان ارشادات کا اس کے سوا اور کوئی منشا نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو جو دل و دماغ دیا ہے تو اسے اس سے سوچنا، سمجھنا اور غور کرنا چاہیئے۔ دوسرے کی فکر و بصیرت کا بلاوجہ پابند نہ ہو اور اپنے ذہن و عقل کو زنگ آلود ہونے سے بچائے۔

مسلمانوں میں جب فکر و نظر، غور و خوض، استدلال و استنباط اور تفقہ و بصیرت سے کام لینے کا عام مذاق و رواج تھا اس وقت علم و فن کے ساتھ ساتھ خود وہ بھی ترقی کر رہے تھے، لیکن جب سے تجسس و تلاش اور جستجو و تحقیق سے کام لینا بند کر دیا گیا ہے ہر قسم کی خرابیاں اور گمراہیاں ان میں گھر کرتی جا رہی ہیں۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ جن ائمہ و فقہاء کی تقلید کو جزو ایمان سمجھ لیا گیا ہے اور اپنے محبوب مسلک کی حقانیت اور متعین امام کی عصمت پر بحث و جدال کے بڑے بڑے معرکے سر کئے جا رہے ہیں خود انہوں

---

[1] یہ روایات و آثار اکثر علامہ ابن البر کی جامع بیان العلم و فضلہ اور حافظ ابن قیم کی اعلام الموقعین سے نقل کئے گئے ہیں
(ع۔ ف)

کبھی اپنی اندھی تقلید کی اجازت نہیں دی۔ امام مالکؒ کا مشہور قول ہے "بجز رسول خدا کے ہر شخص کے قول میں رد و بدل کی گنجائش ہے"۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ میرے قول کے مقابلہ میں اگر کوئی حدیث تمہیں مل جائے تو اسے اختیار کرو اور میرا قول دیوار پر دے مارو"۔ امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ "صحابہ کے بعد جن لوگوں کے اقوال پیش کئے جاتے ہیں ان میں تو بہر حال نظر و فکر کی گنجائش ہے۔ کیونکہ نحن رجال وہم رجال"۔ خود آپ نے اپنے مسلک کو بلا دلیل ماننے کی اجازت نہیں دی۔ آپ کے دو عزیز شاگردوں سے زیادہ بڑھ کر کون آپ کا قدر داں ہو سکتا ہے لیکن ان دونوں نے کئی مسائل میں اپنے شیخ سے اختلاف کیا اور امام ابو یوسفؒ نے تو ایک معاملہ میں اپنے امام کے مسلک کو ترک اور امام مالک کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ "اگر آج امام ابو حنیفہؒ زندہ ہوتے اور ان کے سامنے یہ دلائل ہوتے تو وہ اپنے مسلک سے میری طرح رجوع کر لیتے"۔ ان آئمہ کی بے تعصبی اور حق پرستی کا یہ حال تھا کہ وہ کبھی اپنے قول کی پچ نہ کرتے اور جب کسی معاملہ میں انہیں اپنی غلطی معلوم ہو جاتی تو وہ اسے چھوڑ کر اس راہ کو اختیار کر لیتے جس کی عقل و نقل سے دلیل مل جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سلف میں مقلد کو عالم کہنے کا رواج نہ تھا۔ ابن البر اور ابن قیم دونوں نے اس پر بحث کی ہے۔ علامہ ابن قیم کے الفاظ یہ ہیں:

ولاخلاف بین الناس ان التقلید لیس لعلم وان المقلد لا یطلق علیہ اسم عالم۔

اس بات میں کہ تقلید علم اور مقلد پر عالم کے لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(اعلام الموقعین ج اول ص[illegible])

یہاں چونکہ تقلید کا اصطلاحی لفظ زیر بحث آگیا ہے اس لئے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے علماء نے تقلید کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن تقلید کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی اپنے دل و دماغ کو بیکار بنانے اور ذہن و فکر پر تالا لگائے۔ دین کے معاملات میں جو تقلید کی جاتی ہے اسے اتباع کہا جا سکتا ہے اور وہ جائز بھی ہے۔ تقلید و اتباع کے درمیان فرق ابو عبداللہ بن خویز منداد سے یوں منقول ہے:

التقليد معناه فی الشرع الرجوع الیٰ قول لا حجة لقائله علیه وذلك ممنوع منه فی الشریعة والاتباع ما ثبت علیه حجة وقال فی موضع آخر من کتابه کل من اتبعت قوله من غیر ان یجب علیك قوله لدلیل یوجب ذلك فانت مقلده والتقلید فی دین الله غیر صحیح وکل من اوجب علیك الدلیل اتباع قوله فانت متبعه والاتباع فی الدین سوغ والتقلید ممنوع

(جامع ابن عبدالبر ص ۱۷۳)

شریعت میں تقلید کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی ایسی بات کو اختیار کر لیا جائے جس کی کوئی حجت اس کے کہنے والے کے پاس نہ ہو اور یہ شریعت میں ممنوع ہے اور اتباع اسے کہتے ہیں جس کے ثبوت میں دلیل موجود ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ اگر تم کسی شخص کی بات مانو گے جس کی قائل کے پاس کوئی دلیل ہو تو تم اس کے مقلد کہلاؤ گے اور دین الٰہی میں تقلید صحیح نہیں ہے لیکن جس شخص نے تم سے اپنی بات دلیل کے ساتھ منوائی تو تم اس کے متبع کہلاؤ گے اور اتباع دین میں جائز اور تقلید ممنوع ہے۔

تقلید و اجتہاد کی فقہی بحث ہمارا موضوع نہیں لیکن اس قدر تفصیل اس لئے کی گئی ہے تاکہ یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اسلام انسان کو فکر و نظر کی آزادی کا عظیم حق بخشتا ہے جبکہ دوسرے مذاہب میں اس حق کا کوئی احترام نہیں کیا گیا ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ آدمی اپنے دل و دماغ، عقل و فہم اور ذہن سے کام لے، انہیں سوچنے سمجھنے کا عادی بنائے، اور انہیں مفلوج اور بیکار بنانے سے احتراز کرے۔ (باقی)

---

جناب خالد مسعود صاحب

# تہذیبِ مغرب کا ثمرہ ۔ کثرتِ طلاق

یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں کہ مشرقی روایات رکھنے والے ممالک کی نسبت مغربی ممالک میں طلاق زیادہ عام ہے ۔ اسے دیکھ کر ایک خیال تو یہ ہوتا ہے کہ شاید مغربی ممالک کی روایات ہی کا یہ ثمرہ ہے ۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صرف مغربی ممالک ہی نہیں بلکہ وہ مشرقی ممالک بھی جہاں مغربی تہذیب کے اثرات پہنچ گئے ہیں کثرتِ طلاق کے مسئلہ سے دو چار ہیں ، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبِ مغرب کے ثمرات میں سے ایک ثمرہ کثرتِ طلاق بھی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور امریکہ ہو یا ایشیاء اور افریقہ ، ہر خطے کے " ترقی یافتہ " ممالک میں نکاح کے بندھنوں کا کوئی احترام باقی نہیں رہ گیا ہے ۔

مغربی تہذیب کے یہ اثرات کیوں مرتب ہوتے ہیں ؟ " ترقی یافتہ " ممالک کے مرد و زن نکاح کو احترام کی نگاہوں سے کیوں نہیں دیکھتے ؟ طلاق کی کثرت کے اسباب کیا ہیں ۔ ؟ یہ اور اس طرح کے بے شمار سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں ، ان کا عموماً یہ جواب دیا جاتا ہے کہ مغربی تہذیب مرد و زن میں مساوات کی علمبردار ہے ۔ وہاں کی عورت آزاد ہے ، وہ شوہر کی غلام نہیں ، اسی لئے نکاح اسی وقت تک قائم رکھا جاتا ہے ، جب تک میاں بیوی ایک دوسرے سے مطمئن ہوں ۔ جب اطمینان ختم ہو جاتا ہے تو رشتہ مناکحت بھی ٹوٹ جاتا ہے ۔

ان سوالوں کا یہ جواب ، اگرچہ صحیح ہے تاہم مکمل صورت حال کو نگاہوں کے سامنے نہیں لاتا ۔ امریکہ کے بین الاقوامی رسالہ لائف میں کچھ عرصہ پیشتر ایک سلسلہ مضامین شائع ہوا تھا جس میں مضمون نگار نے امریکہ میں اس مسئلہ کے خد و خال واضح کئے تھے ۔ یہ مضمون ہم اگرچہ

بلکہ زیادہ مکمل نہیں تاہم اس کے بین السطور سے کچھ اہم نکات تلاش کرنا مشکل نہیں۔

امریکہ میں کثرت طلاق کی سنگینی واضح کرنے کے لئے لائف کے مضمون نگار نے ایک ماہر شماریات ڈاکٹر جیکب سن کا اندازہ یہ بتایا ہے کہ امریکہ میں ڈیڑھ کروڑ مرد و عورت طلاق یافتہ ہیں اور اٹھارہ برس سے کم عمر کے چالیس لاکھ بچے وہاں ایسے ہیں جن کے والدین ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ایک صدی پیشتر ۱۸۶۱ء میں امریکہ میں ساڑھے چھ ہزار طلاقیں ہوئیں۔ اس سے پچاس برس بعد ۱۹۱۱ء میں طلاقوں کی تعداد نوے ہزار تھی۔ ۱۹۶۱ء کے دوران ملک میں چار لاکھ طلاقیں واقع ہوئیں اور سال رواں کے بارے میں ماہرین شماریات کی پیشگوئی یہ ہے کہ ہر چار میں سے ایک شادی کا خاتمہ طلاق کی شکل میں ہو گا۔ کثرتِ طلاق کا مسئلہ امریکہ میں اتنا پیچیدہ ہو گیا ہے کہ جگہ جگہ مشیرانِ شادی کے دفاتر کھل رہے ہیں۔ اخباروں میں ناخوش جوڑوں کے لئے ہدایات نکلتی ہیں۔ صرف لاس اینجلز کی ٹیلیفون ڈائرکٹری میں دو صفحات اور تین کالم مشیرانِ شادی کے اشتہارات کی نذر ہو جاتے ہیں۔

کثرت طلاق کا جہاں یہ عالم ہو وہاں رشتۂ مناکحت کے احترام کا تصور کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ اسی صورت حال کا ایک عجیب تجزیہ ایک ماہر عمرانیات نے یوں کیا کہ

"لوگ یہاں شادی شدہ ہیں۔ مگر وہ لازماً سال یا دو سال پیشتر کی بیویوں ہی کے شوہر نہیں۔ کبھی کبھی میرا یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم کہنے کی جرأت کریں یا نہ کریں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہماری پوری قوم نے تجرباتی شادیوں کا نظام اپنا لیا ہے۔ مرد ایک عورت سے نکاح کرتے ہیں جب اس سے جی بھر جاتا ہے تو اسے طلاق دے کر دوسری عورت سے شادی رچا لیتے ہیں"

خود ماہرین عمرانیات کے درمیان کثرت طلاق کے اسباب کی نشاندہی کے بارے میں اچھا خاصہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک ماہر نفسیات کا نام ... جس کے سامنے طلاق کے ساڑھے تین ہزار مقدمات پیش ہوئے کی رائے میں بیشتر طلاقیں ان جوڑوں میں واقع ہوئیں جن کی شادی کی ابتدا ہی ایسی تھی کہ اس کا نتیجہ سوائے طلاق کے کسی دوسری شکل میں نہیں نکل سکتا تھا۔

... جوڑوں کو قبل از وقت شادی کے بندھن میں اس لئے کا ... کر

کورٹ شپ کے دوران ہی لڑکی حاملہ ہو گئی تھی۔ ایسی شادیوں کے سے فریقین ذہنی طور پر تیار نہ تھے چنانچہ ازدواجی زندگی کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ تعلقات میں کشیدگی آ گئی اور بالآخر رشتہ نکاح کاٹ دیا گیا۔ جیک نارمن کی رائے میں اس کے علاوہ مالی مشکلات، کمزوری صحت اور شراب خوری کی عادت طلاق کا باعث بنی۔

ایک ماہر عمرانیات جان تھامس نے ایسی شادیوں کا مطالعہ کیا جو محض اتفاق یا مجبوری کے تحت نہیں ہوئی تھیں۔ بلکہ زوجین نے خوب غور و فکر اور رات دن کی دعاؤں کے بعد شادی کا قدم اٹھایا تھا۔ یہ جوڑے جلد بازی میں الگ نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے طلاق کا حتمی فیصلہ کرنے میں کافی وقت لیا۔ ان طلاقوں کی نوبت مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر عمل میں آئی۔

| | |
|---|---|
| کثرت شراب خوری | ۳۰ فی صد طلاقیں |
| زنا | ۲۵ " " " |
| غیر ذمہ دارانہ رویہ | ۱۲ " " " |
| اختلاف مزاج | ۱۲ " " " |

بعض لوگوں کے نزدیک کثرت طلاق کی ایک وجہ یہ ہے کہ طلاق بہت آسان چیز بنا دی گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ طلاق لینا یا دینا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا اور جن لوگوں سے یہ جرم سرزد ہوتا تھا ان کے متعلق معاشرے میں سرگوشیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب صورت یہ ہے کہ عورت خود کما سکتی ہے۔ طلاق کے بعد اس کی حیثیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر زوجین کے مذہبی یا اخلاقی نظریات اور بچوں کا مسئلہ مانع نہ ہو تو کوئی طاقت اب میاں بیوی کو اکٹھے رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ خود اس طرح رہنے کے خواہشمند نہ ہوں۔

کثرت طلاق کے اسباب کے تعین میں اختلاف کے باوجود ماہرین شماریات چند باتوں پر متفق ہیں۔ مثلاً یہ کہ امریکہ کی یہودی یا کیتھولک آبادی میں طلاق کے واقعات شاذ و نادر پیش آتے ہیں اس کا زیادہ تر مشاہدہ ان لوگوں میں ہوتا ہے جو مذہب کو فرسودہ اور بے مقصد چیز سمجھتے ہیں نیز شہری آبادی کی نسبت دیہی آبادی میں سوسائٹی کے دباؤ کی وجہ سے طلاق کم ہوتی ہے۔

مغرب ترقی یافتہ دنیا، کے اس مسئلہ کے اسباب میں جتنا کچھ اختلاف ہے اس کے باوجود یہ اعداد

لگانا کچھ مشکل نہیں کہ طلاق کی اس کثرت کے پیچھے کون سے اہم عوامل کار فرما ہیں۔ معمولی غور و فکر کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب جن اصولوں سے ترکیب پاتی ہے انہی کے برگ و بار میں سے یہ مسئلہ بھی ہے۔

یہ تہذیب مذہب کو ایک فرسودہ اور غیر عقلی چیز سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک کسی آدمی کا مذہبی ہونا اس کی بیوقوفی یا کم از کم پست ہمتی اور بزدلی کی دلیل ہے۔ مذہب، خاندان اور سوسائٹی کی تشکیل میں یا اجتماعی مسائل میں کوئی خاص کردار ادا کر سکتا ہے، یہ تہذیب اس کی قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب نے اپنی معاشرت کو بالکل الگ اصولوں پر اٹھایا ہے اور قدرتی طور پر یہاں نکاح و طلاق اور زوجین کے حقوق و فرائض کا تصور وہ نہیں جو مذہب اپنے پیروکاروں کو دیتا ہے۔ یہاں مرد و عورت دونوں کو اپنی مرضی کا کردار ادا کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اگر اس پر کوئی قدغن لگائی جائے تو وہ ایک دوسرے کو قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے جہاں آزادی بے اصولی کا نام ہو وہاں یہ مسائل اگر روز افزوں ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مذہب کا فرد و اجتماع کے سنوارنے میں کتنا ہاتھ ہے؟ وہ مندرجہ بالا اس بیان سے واضح ہے کہ امریکہ کے یہودیوں اور کیتھولک عیسائیوں میں خاندان کا شیرازہ ابھی تک بکھرنے نہیں پایا۔

دوسری بنیادی چیز عورت کے مقام کا تعین ہے۔ لائف کے مضمون نگار نے انڈیانا یونیورسٹی کے ایک ماہرِ عمرانیات ڈاکٹر کرک پیٹرک کا ایک تجزیہ بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک امریکی عورت کے سامنے تین قسم کی بیوی بننے کے مواقع ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ گھریلو قسم کی عورت بن کے رہے، دوسرے یہ کہ اس کی حیثیت محض مرد کے کھلونے کی ہو، وہ اپنی جوانی حسن اور رعنائی کو قائم رکھ کر خاوند اور اس کے دوستوں کو خوش رکھنے کا سامان کرے۔ تیسرے یہ کہ وہ حصہ دار بیوی بن کر رہے۔ یعنی وہ خود روزی کما کر اپنے اخراجات پورے کرے۔

خاوند کے ساتھ اس کا تعلق محض رفاقت کا ہو۔ اس تقسیم میں دوسری اور تیسری قسم کی عورت کا تعلق اپنے شوہر سے محض برائے نام ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی عورت دراصل اپنے شوہر کی ملازمہ ہوتی ہے۔ جب تک اس کا حسن اور رعنائی باقی رہے اس کی ملازمت کے امکانات بس اسی حد تک ہوتے ہیں۔ تیسری قسم کی عورت اپنے اوپر کسی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتی اس لئے

معمولی سے معمولی اختلافات پر وہ اپنا رستہ الگ کر سکتی ہے۔ صرف پہلی قسم کی بیوی کی حیثیت ایسی ہے کہ نہ مرد اسے آسانی سے چھوڑ سکتا ہے اور نہ وہ خود ہی الگ ہونے میں اپنا مستقبل محفوظ پا سکتی ہے۔ اگرچہ پائیدار شادی کی قسم صورت یہی ہے اور اسی سے مضبوط سوسائٹی تشکیل پا سکتی ہے تاہم امریکہ میں "آزادیٔ نسواں" کے نعرے بلند کرنے والی خواتین اس حیثیت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں، بلکہ جو عورتیں اس طرح اپنی زندگی گزار رہی ہیں ان کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتیں۔

ہمارے نزدیک عورت کو اس کے اصل منصب سے ہٹا کر اسے کھیل تفریح کے لیے بیوی بنانے میں یا پھر اس پر کمانے کی ذمہ داری ڈال دینے میں وہ تمام مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ کثرتِ طلاق کی صورت میں نکلتا ہے۔ چنانچہ لالفسکے اسی شمارے میں بااولاد اور بے اولاد عورتوں کی طلاقوں کی نسبت ایک اور چار بتائی گئی ہے۔ اگرچہ اس کی مزید وضاحت نہیں کی گئی تاہم ہمارا خیال ہے کہ بااولاد عورتیں پہلی قسم سے تعلق رکھنے والی ہوں گی جب کہ بے اولاد سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کی شادی کا مقصد گھر گرہستی کی ذمہ داریاں ادا کرنا نہیں بلکہ مرد کا کھلونا یا ساتھی بن کر رہنا ہے۔

پھر مغربی تہذیب کے مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کے فلسفہ کے مفاسد کا ایک اندازہ مذکورہ بالا مضمون سے ہو جاتا ہے۔ کورٹ شپ کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ شادی سے پہلے اس مرحلے سے گزرنے کے بعد ہونے والے میاں بیوی ایک دوسرے کی طبیعتوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیتے ہیں اور اس کے بعد جو شادیاں ہوتی ہیں وہ زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ لیکن تجربے نے یہ بتایا ہے کہ کورٹ شپ سے اپنے ساتھی کے بارے میں اندازہ غلط ہونے کے امکانات بزرگانِ خاندان کے فیصلہ کی نسبت بے حد زیادہ ہیں۔ اگر کورٹ شپ پائیدار نکاحوں کے وجود میں لانے کا کوئی ذریعہ ہوتا تو امریکہ میں طلاق کی یہ کثرت ہرگز نہ ہوتی۔ کورٹ شپ کا نظری مفہوم اگرچہ یہ ہے کہ کورٹ شپ کرنے والے زن و شو کے تعلقات اس عرصہ میں قائم نہ کریں لیکن عملی طور پر اس کے تقاضے پورے کرنا ناممکن ہے۔ اس معاملے میں انسانی فطرت کو نظر انداز کر کے محض اصول کا سہارا لینا بڑی حماقت ہے۔

مذکورہ بالا مضمون سے خرابات نوشی کا ایک ایسا نقصان بھی واضح ہوتا ہے جس کی

طرف عام طور پر لوگوں کی توجہ نہیں ہے ۔ مغرب زدہ طبقہ کی نظر میں اصل قدر و قیمت تو مغرب کے طور طریقے کی ہوتی ہے ۔ وہ اسلام کی ہر بات میں مین میخ نکالتے ہیں ۔ اسلام نے شراب نوشی سے منع کیا ہے ، ہمارے مغرب زدہ طبقہ کے نزدیک شراب نوشی کے اجتماعی نقصانات تو سرے سے ہیں ہی نہیں ، اس کا اثر محض فرد پر پڑتا ہے اور یہ بھی عموماً اچھا ہی ہوتا ہے کیونکہ آدمی کی صحت کے لئے شراب نوشی مفید ہے اور نشہ کی حالت میں آدمی کی قوتِ کار بڑھ جاتی ہے لیکن طلاق کے اعداد و شمار سے معلوم ہوا کہ تقریباً ایک تہائی طلاقیں محض شراب کے بُرے اثرات کے تحت وارد ہوتی ہیں ۔ گویا شراب سے فرد کی قوتِ کار میں وقتی طور پر چاہے کتنا ہی اضافہ ہو جاتا ہو لیکن دوسرے اجتماعی مفاسد سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف خاندان کے دائرے میں اس کے بُرے اثرات حد درجہ وسیع ہیں ۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کا نظم زیادہ اہم ہے یا افراد کی وقتی لذت کا اہتمام ؟ اگر اوّل الذکر چیز زیادہ اہمیت کی حامل ہے تو شراب نوشی کے قصیدے پڑھنے کے کیا معنی ؟

مغربی ممالک میں کثرتِ طلاق کا مسئلہ حد درجہ پریشان کن ہے ۔ اس کی حیثیت سوسائٹی کے ایک ناسور کی ہوگئی ہے ۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ بعض ایسے ممالک جہاں کی روایات اس وبا کو قبول کرنے کے خلاف تھیں ، محض تقلیدِ مغرب کے شوق میں کثرتِ طلاق کو بھی ملک میں رائج کر رہے ہیں ۔ چنانچہ مصر میں اس کا وہی عالم ہے جو امریکہ میں ہے ۔ لائف کے مضمون نگار نے یہ دیکھ کر بہت اچھی چوٹ کی ہے کہ لوگوں نے امریکہ کے کوکا کولا ، وہاں کی گاڑیوں ، ہالی وڈ کی فلموں کو درآمد کیا ہے تو یہاں کے کثرتِ طلاق کے مسئلہ کو بھی انہوں نے امریکہ سے برآمدی مال کا درجہ دے دیا ہے ۔ معلوم نہیں " ترقی پسند " لوگوں کو مغرب کی ان اقدار کی نقالی کیوں سوجھتی ہے جن کے مفاسد سے خود اہلِ مغرب پناہ مانگتے ہیں ؟

جناب خالد مسعود صاحب

# نبیؐ کا فیضانِ نظر

(مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ایک عربی مضمون سے ترجمہ)

درسگاہ نبوی میں جن لوگوں نے تربیت حاصل کی یا وہاں کے شاگردوں میں سے تھے وہ اس رنگ میں رنگے ہوئے تھے کہ فکرِ آخرت ان پر غالب تھی۔ یہ ان کے اندر اسی طرح جاری و ساری تھی جس طرح روح اور خون جاری ہوتے ہیں۔ ان کے رگ و ریشہ میں اس کا اثر اتنا تھا کہ نہ وہ آخرت کو کبھی بھولتے، نہ اس کا بدل چاہتے اور نہ اس پر کسی دوسری چیز کو ترجیح دیتے۔ اگر آپ درسگاہِ نبوی کے شاگردوں کے اس غالب جذبہ کا مشاہدہ کرنا چاہیں تو اس کے لئے حضرت علیؓ کے اوصاف پر ایک نگاہ ڈالنا کافی ہوگا۔ اسی سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ درس گاہ نبوی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے نتیجہ میں کس قسم کے انسان تیار ہوئے۔

ابوصالح سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ بن ابوسفیانؓ نے ضرار بن ضمرہؓ سے کہا "میرے سامنے حضرت علیؓ کے اوصاف بیان کیجئے۔"

ضرار نے کہا۔ "آپ مجھے اس سے معاف ہی رکھیے۔"

معاویہؓ نے مزید اصرار کیا "نہیں آپ ضرور بیان کریں۔"

وہ کہنے لگے "کیا آپ مجھے اس سے معاف نہیں رکھیں گے؟"

معاویہ نے جواب دیا "ہرگز نہیں میں آپ کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔"

اس پر ضرارؓ نے بیان کیا "خدا کی قسم حضرت علیؓ بہت بلند نظر اور مضبوط آدمی تھے۔ بات صاف صاف کرتے تھے اور فیصلہ عدل و انصاف سے کرتے تھے۔ آپ کے پہلوؤں سے علم پھوٹتا

تھا۔ آپ ہر لحاظ سے حکیمانہ بات کرتے تھے۔ دنیا اور اس کی چمک دمک سے آپ کو نفرت تھی مگر رات اور اس کے اندھیرے سے آپ کو انس تھا۔ خدا کی قسم آپ خدا کے خوف سے بہت رونے والے اور گہری سوچ بچار میں پڑنے والے تھے۔ آپ اپنی ہتھیلی کو الٹا کرتے اور اپنے نفس کو مخاطب کیا کرتے تھے۔ آپ کو لباس وہ پسند تھا جو موٹا جھوٹا ہو اور کھانا وہ پسند تھا جو معمولی ہو۔ اللہ کی قسم وہ ہماری ہی طرح تھے۔ جب ہم آپ سے کچھ پوچھتے، آپ اس کا جواب دیتے۔ جب ہم آپ کے پاس حاضر ہوتے، آپ ہمارا استقبال کرتے۔ جب ہم آپ کو بلاتے، آپ بلا تکلف تشریف لے آتے۔ آپ کی اس بے تکلفی اور قرب کے باوجود ہمارا حال یہ تھا کہ ہم نہ ان کی ہیبت کی وجہ سے بات کر سکتے تھے اور نہ ان کی عظمت کی وجہ سے ان کی طرف بڑھ سکتے تھے۔ آپ جب تبسم فرماتے تو آپ کے دانت ایسے معلوم ہوتے جیسے ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہوں۔ اہل دین کی آپ عزت کرتے، مساکین سے آپ کو محبت تھی۔ نہ کوئی بااثر آدمی آپ سے کسی باطل میں تعاون کی امید رکھتا تھا اور نہ کوئی بے اثر آدمی آپ کے عدل سے مایوس ہوتا تھا۔ میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ایک مرتبہ میں نے آپ کو عبادت میں مصروف دیکھا۔ اس وقت رات نے اپنے پردے ڈال دیئے تھے اور ستارے ڈھل گئے تھے۔ آپ اپنی جائے نماز میں اپنی داڑھی پکڑے ہوئے کھڑے تھے۔ آپ اس طرح پہلو بدل رہے تھے جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اس شدت کا گریہ طاری تھا جیسے کوئی بہت ہی غمزدہ آدمی رو رہا تھا۔ میں ابھی تک گویا انہیں یہ کہتے سن رہا ہوں: "اے دنیا! کیا تو میرے پیچھے پڑ گئی ہے یا تجھے مجھ سے محبت ہو گئی ہے؟ دفع ہو جا۔ کسی دوسرے کو جا کر دھوکا دے۔ میں تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں۔ اب میں تیری طرف رجعت نہیں کروں گا۔ تیری عمر مختصر اور تیری زندگی حقیر ہے۔ لیکن تیرے ساتھ جو خطرہ وابستہ ہے وہ بہت بڑا ہے۔ ہائے افسوس! زادِ راہ کم، سفر لمبا اور رستہ وحشتناک ہے۔"

ایک دوسری مثال لیجئے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے صحابی کا خطبہ ہے جنہیں اسلامی حکومت کے ایک بڑے دارالخلافہ کا امیر مقرر کیا گیا تھا۔

خالد بن عمیر العدوی سے روایت ہے۔ وہ بتلاتے ہیں کہ بصرہ کے امیر عتبہ بن غزوان نے ایک مرتبہ ہمیں خطبہ دیا۔ آپ نے خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

"دنیا نے منہ پھیر لیا ہے اور پیٹھ پھیر کر بھاگی جا رہی ہے۔ اب اس کا اتنا ہی حصہ باقی
رہ گیا ہے جتنا کوئی آدمی برتن میں پانی پی کر تھوڑا سا تلچھٹ چھوڑ دیتا ہے۔ بلاشبہ تم لوگ دنیا کو
چھوڑ کر ایک ایسے گھر کو جانے والے ہو جسے زوال ہرگز نہیں۔ لہٰذا تم وہاں جاؤ تو اچھا توشہ
لے کر جاؤ۔ کیونکہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ایک پتھر جب دوزخ کے کنارے سے گرایا جائے گا تو
وہ ستر سال تک بھی اس کی تہہ کو نہ پا سکے گا۔ اس کے باوجود، خدا کی قسم، دوزخ بھر دی جائے گی۔
کیا تمہیں یہ سن کر تعجب ہوتا ہے؟ تو لو اور سنو۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جنت کے دو پھاٹکوں کے
درمیان فاصلہ چالیس سال کی مسافت کا ہوگا لیکن اس کے لئے بھی ایک دن ایسا آئے گا کہ وہاں
کھوے سے کھوا چھلتا ہوگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اپنا وہ دن بھی ہے جب ہم سات آدمی نبی
صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ ہمارے پاس درخت کے پتوں کے علاوہ کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔
پتے کھا کھا کر ہمارے جبڑے زخمی ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ایک چادر ملی تو میں نے
اس کے دو ٹکڑے کئے۔ ایک ٹکڑا میں نے اپنے لئے رکھا اور دوسرا سعد بن مالک کو دیا۔ ان ٹکڑوں
سے ہم نے اپنے ازار بنائے۔ خدا کی قسم آج ہم میں ہر ایک کسی نہ کسی شہر کا حاکم ہے۔ میں اس بات
سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ خود اپنی نظروں میں تو میں بہت بڑا ہوں لیکن خدا کے ہاں مجھے چھوٹا
سمجھا جائے۔ جب کبھی کوئی نبوت ختم ہوئی ہے تو اس کے بعد لازماً ملوکیت کا دور شروع ہو جاتا
رہا ہے۔ ہمارے بعد تم لوگ بھی امراء کا تجربہ کرو گے۔" (المسلمون)

---

(تبصرے کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں۔ ادارہ میثاق ان کتابوں پر تبصرہ کرنا اپنی ذمہ داری نہیں سمجھے گا جن کا صرف ایک نسخہ وصول ہوگا)

## تزکیہ نفس  مکمل دونوں حصے

تالیف :- مولانا امین احسن اصلاحی

صفحات ۳۴۴ قیمت :- قسم اول چھ روپے۔ قسم دوم :- ساڑھے چار روپے

ناشر :- ملک برادرز۔ کارخانہ بازار۔ لائل پور

دین کے نظام میں تزکیہ نفس کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ دوسرے علمی دلائل سے قطع نظر اسی حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اس کی خاطر تصوف کے نام سے ایک مستقل نظام قائم کر لیا۔ تزکیہ نفس کی غیر معمولی اہمیت ہی کی بدولت اس نظام کی جڑیں مسلمان معاشرے میں اتنی گہری ہو گئیں کہ صدیوں کے بعد بھی یہ اپنے وجود کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ لیکن تزکیہ نفس کا مفہوم کیا ہے اور اس کے حدود کار کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ہمیشہ افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے۔ اس مسئلہ پر صحیح دینی نقطۂ نظر پیش کرنے والی کتابیں اگرچہ ناپید نہیں لیکن بہت کم ہیں اور ہمارے زمانے میں زیر نظر تالیف کے علاوہ کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔

اس کتاب کے لکھنے سے محترم مؤلف مدظلہ کے سامنے جو مقصد رہا ہے وہ انہی کے الفاظ میں اس طرح بیان ہوا ہے:

"میں نے اس کتاب میں ان لوگوں کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے تزکیہ نفس کے وہ

اصول و مبادی انشاء اللہ سامنے آجائیں گے جو کتاب و سنت میں بیان ہوئے
ہیں اور ساتھ ہی وہ بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی جو غلط قسم کے تصوف کی راہ
سے ہمارے اندر پھیل چکی ہیں۔

اس کتاب کا اسلوب تمام تر علمی ہے۔ اس کے صفحہ صفحہ سے دین کی عبادات اور تعلیمات کی حکمت واضح ہوتی ہے۔ غور و فکر کے ساتھ اس کتاب کو پڑھنے والا قدم قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ صاحب کتاب نے ایک بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مؤلف محترم مدظلہ نے کتاب کا علمی پایہ اس کے دیباچہ میں بدیں الفاظ پیش فرمایا ہے۔

"فکری اعتبار سے یہ کتاب میرے دینی فکر کا لب لباب ہے۔ برسوں کے غور و مطالعہ
سے دین و شریعت کی جو روح میری سمجھ میں آئی ہے اس کا ایک حصہ میں نے اوراق
میں الفاظ کے جامہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔"

جب تزکیہ نفس کا لفظ سامنے آتا ہے۔ تو خیال ہوتا ہے کہ اس کتاب میں اس طرح کی روایتی باتیں درج ہوں گی جس طرح کی باتیں صوفیاء کے ہاں بتائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کتاب میں تزکیہ نفس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس سے علم و عمل دونوں کا تزکیہ مراد لیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

"اس کتاب میں ایک خاص چیز جو ہر پڑھنے والا پہلی ہی نظر میں محسوس کرے
گا وہ یہ ہے کہ میں نے تزکیہ کو زندگی کے تمام اطراف پر حاوی کر دیا ہے۔ تصوف میں
تزکیہ زندگی کے ایک نہایت محدود گوشہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن کتاب و سنت میں جس
تزکیہ کا بیان ہے وہ ہماری زندگی کے ہر گوشہ سے بحث کرتا ہے۔ اس سے میری مراد
صرف انفرادی زندگی ہی کا ہر گوشہ نہیں ہے بلکہ اجتماعی زندگی کا بھی ہر گوشہ ہے۔"

تزکیہ نفس کے اس تصور کے تحت زیر نظر کتاب کے مباحث کی وسعت کا اندازہ
اس کے چند اہم عنوانات سے ہو سکتا ہے جو یہ ہیں۔
دین میں تزکیہ نفس کی اہمیت اور اس کی عملی ضرورت ــــــ تزکیہ کا لغوی مفہوم،

اس کا مقصد اور اس کی وسعت ــــ تزکیۂ علم ــــ خدا کی معرفت کے بارہ میں صحیح مسلک
تدبر قرآن ــــ اسوہ حسنہ ــــ منصب رسالت سے متعلق چار بنیادی غلط فہمیاں ــــ نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت ــــ حجابات علم ــــ آفات علم ــــ ان کا
علاج ــــ تزکیۂ عمل ــــ نماز ــــ انفاق ــــ روزہ ، حج کی برکات اور آفات ،
آفات کا علاج۔ گویا اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف فکر و نظر اور عمل سے تعلق رکھنے والی
بیماریوں کی نشاندہی ہوتی ہے بلکہ ان بیماریوں کی بیخ کنی کے طریقے بھی معلوم ہوتے ہیں اس طرح
آدمی نہ صرف اس کتاب کی روشنی میں اپنے علم و عمل کا محاسبہ کر سکتا ہے بلکہ ان کی صحیح تربیت کی
راہیں بھی متعین کر سکتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے بیحد مفید ہے۔ یہ کتاب مجلد
ہے۔ اور ناشر کے علاوہ مکتبہ میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے بھی مل سکتی ہے (رخ م)

---

ISLAM AND THE WORLD

تالیف :۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی

ترجمہ :۔ ڈاکٹر محمد آصف قدوائی

صفحات :۔ ۲۱۴ ۔ قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ :۔ القادر ناشرین کتب اسلامی ۱۴ ایمپرس روڈ لاہور نمبر ۵

"مسلمانوں کا عروج و زوال اور دنیا پر اس کے اثرات" کے موضوع پر محترم مصنف کی
یہ کتاب علمی حلقوں میں جانی پہچانی ہے۔ اس کے عربی اور اردو ایڈیشن کئی سال پہلے چھپ چکے
ہیں۔ اب اس کا انگریزی ترجمہ "اسلام اینڈ دی ورلڈ" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر
قدوائی صاحب کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اور حق یہ ہے کہ انہوں نے بڑی سلاست اور روانی کے
ساتھ اسے نبھایا ہے۔ زبان کی خوبصورتی اور اثر انگیزی دونوں اس میں پائی جاتی ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل
کی دنیا کے مذہبی، فکری، سیاسی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ
اس وقت آسمانی ہدایت کے لیے دنیا کس قدر پیاسی تھی اور اس پیاس کو بجھانے میں آنحضور
صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پوری طرح کامیاب رہی۔ بعثت کے تذکرہ کے بعد خیر امت کے

[illegible] پھر زندگی کے وہ اثرات بتائے گئے ہیں جو دوسری قوموں پر مترتب ہوئے مسلمانوں کے زوال کے بعد تہذیب مغرب کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ چنانچہ محترم مصنف نے تہذیب مغرب کی اہمیت اور انسانیت پر اس کے اثرات کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اسی جائزہ کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ دنیا کسی بے خدا نظام سے نہیں بلکہ صرف اسلام سے مطمئن ہو سکتی ہے۔ یہ تمام بحثیں بڑی مدلل، معلومات افزا اور اثر آفریں ہیں۔ محترم مصنف نے دوسرے اہل قلم کے حوالے بھی کثرت سے دیئے ہیں۔

انسانی کردار پر اسلام کے اثرات دکھانے کے لیے چند مسلمانوں کی عملی زندگی کی جو مثالیں دی گئی ہیں وہ بڑی مؤثر اور مادہ پرستی کے اس دور کے خود غرض انسانوں کے لئے بڑی سبق آموز ہیں۔

کتاب کے آخری باب میں دنیا کی مشکلات کا حل مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کو بتایا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں مسلمانوں کے طرز عمل کی ناکامی کی اس سے زیادہ ضرورت تھی جتنی محترم مصنف نے کی ہے۔ یہ باب مسلمانوں کی گراں خوابی کے لئے صدائے کوس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں جس قدر تفصیل سے کام لیا جاتا اتنا ہی اچھا ہوتا۔

محترم مصنف نے مسلمانوں کے دور انحطاط کی جو تصویر پیش کی ہے، اس سے تبصرہ نگار کو تھوڑا سا اختلاف ہے۔ مصنف محترم نے خلافت راشدہ کے خاتمہ کے فوراً بعد اسلام اور اسلامی حکومت کی جو حالت زار پیش کی ہے، امر واقعہ شاید یہ نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اسلام نے ان تمام نظامہائے زندگی کی نسبت جو دنیا میں رائج ہو سکے ہیں، اجتماع پر سب سے زیادہ پائیدار اثر ڈالا اور صحابہ کے بعد کئی نسلوں تک معاشرے پر اسلام کا [illegible] کی بدولت [illegible] کو کھل کر [illegible] پھیلانے کی مدتوں جرأت نہیں ہوئی۔ محترم مصنف نے حکومتوں کے خلاف حق پسند علماء کی بغاوتوں کا جو تذکرہ کیا ہے، ہمارے نزدیک اس میں بھی اختلاف کی گنجائش ہے جن لوگوں نے قائم حکومتوں کے خلاف مسلح بغاوتیں کی ہیں کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ان کے اس طرز عمل کو حق بجانب ٹھہرانا ممکن نہیں۔ اس ضمن میں یہ مشاہدہ بھی [illegible] تعجب خیز ہے کہ [illegible] کرنے والوں میں ان لوگوں کے نام نہیں ملتے جو [illegible]

البتہ یہ بات اس حد تک درست ہے کہ علمائے حق نے دین کو زندہ رکھنے کے لئے بڑی قربانیاں دیں۔ انہوں نے علمائے وقت پر بے باکانہ تنقید کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایسی شاندار روایات قائم کی ہیں کہ امت کبھی ان کے احسان فراموش نہ کر سکے گی۔ مگر ہمارے زمانہ کی بدقسمتی ہے کہ بعض لوگ ان بزرگوں کی اشاعت علم و فن کی کوششوں کی تہ میں بھی سیاسی انقلابات کے محرکات ثابت کرنے کے درپے ہیں۔

انگریزی ایڈیشن کی اس اشاعت نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب غیر مسلموں کو اسلام سے روشناس کرانے کے لئے اور خود مسلمانوں کو ان کی کوتاہیوں کا احساس دلانے کیلئے بیحد مفید ہے۔

ترجمہ میں دو تین جگہ فاضل مترجم کی فروگذاشت کی وجہ سے محترم مصنف کا نقطۂ نظر سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ ان مقامات کی طرف دوسرے اہل علم اشارہ کر چکے ہیں۔ (خ۔م)

---

# جارحانہ فرقہ پرستی • فسادات جبلپور و ساگر

ترتیب :۔ ابوالفہیم وحید حیدرآبادی

ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ الہلال مسجد عبداللہ، الہ آباد نمبرا (بھارت) یا مکتبہ چراغ راہ۔ اشرف چیمبرز۔ بندر روڈ، کراچی

یہ دونوں کتابیں جن کی ضخامت علی الترتیب ۴۰ ۲ اور ۲۰۷ صفحات اور قیمت اڑھائی روپے اور دو روپے ہے، ان فسادات کی روداد پر مشتمل ہیں جو پچھلے ڈیڑھ سال کے عرصہ میں جبل پور، ساگر، علی گڑھ، میرٹھ، بابوڑ وغیرہ میں ہوئے اور جن میں ملک کی اکثریت نے ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت مسلمان اقلیت کو اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ ان کتابوں کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے فسادات کے تفصیلی واقعات کی مختلف رپورٹیں بھی آجائیں اور ملک کے اکابرین، حکومت، پارلیمنٹ اور صحافت سب کا ردِ عمل بھی معلوم ہو جائے۔ اس طرح ان فسادات کو مختلف زاویوں سے سمجھنے کا مواد ان مختصر کتابوں میں مل جاتا ہے۔ یہ کتابیں اگر بھارت کے مسلمانوں میں ایسے حالات کے جرأت مندانہ مقابلہ کا ردِ عمل پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارے خیال میں یہ ایک عظیم جہاد سے بڑھا ہو گا۔

فسادات جبل پور و ساگر پر اسی نوعیت کی انگریزی کتاب THE HOLOCAUST OF JABALPUR AND SAG مرتبہ حکیم محمود حسن بھی مذکورہ بالا پتہ سے مل سکتی ہے اس کی قیمت سوا روپیہ ہے۔

---

# اعجاز القرآن

تصنیف :- محمد افضل شریف

ضخامت :- ۱۰۴ صفحات قیمت :- حسب استطاعت

ملنے کا پتہ :- محمد افضل شریف ۵۴ اپنشن لین - یوپی - حیدرآباد دکن (انڈیا)

اس کتاب کی تصنیف کا مقصد قرآن مجید کی عظمت و شان بیان کرنا ہے۔ اس کے اہم تر دو ہیں۔ ایک مذاہب عالم کی اہم کتابوں میں نزول قرآن مجید کی پیشین گوئیاں اور دو کی خصوصیات۔ اول الذکر باب میں مصنف نے مشہور مذہبی کتابوں کے بے شمار حوالے کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تمام کتابیں خدا کی آخری کتاب کی نوید سناتی چلی آئی ہیں۔ کتا اس حصہ سے اچھی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ثانی الذکر باب میں قرآن مجید کی جو خصوصیا کی گئی ہیں ان میں دلچسپ نکات تو کافی ملتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس طرح ات کی نہ کوئی خاص ضرورت ہے اور نہ ان سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اگر چہ ے کے الفاظ کی کھینچ تان کر کے ہم قرآن مجید سے علم حساب، علم الجبرا، علم جیومیٹری وغیرہ ثابت بھی کر لیں تو اس میں قرآن مجید کی خدمت کا کون سا پہلو پیدا ہوتا ہے۔ قرآ بات کا خود دعویٰ ہی نہیں کرتا اس کے اثبات کے لئے آیات کی کھینچ تان کر قرآن میں خود ساختہ قسم کا اعجاز ثابت کرنا ہمارے نزدیک دانش مندی کی بات نہ کتاب کی باقی تمام بحثوں کی افادیت اور ان کا باہمی ربط تبصرہ نگار کی سمجھ میں نہیں ہیں اعجاز قرآن کے موضوع سے کس طرح متعلق ہیں؟ یہ جاننے کے لئے قارئین کو مند کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

---

مدیر، پرنٹر، پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ثقافت اسلامیہ ۲ کلب روڈ لاہور سے شائع